دھرتی کا کال

جوگندر پال

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

بار اوّل — اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

تعداد طباعت — ایک ہزار

طباعت — محبوب المطابع برقی پریس دہلی

قیمت:- دو روپے آٹھ آنے

فہرست

درشناں کے نام

ایک تعارف

پہلی بار جب میں جوگندر پال سے ملا تو وہ مجھے اپنی شکل وصورت وضع قطع، کردار و اطوار کے اعتبار سے ایک مالدار جوہری نظر آیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا قیاس زیادہ غلط بھی نہ تھا۔ وہ جوہری تو ضرور ہے لیکن میرے جواہرات کا نہیں، افسانوں کا! —— اور مالدار بھی ہے لیکن اپنے فن میں!

جوگندر پال نے اردو افسانے کی دنیا میں ایک نئے ماحول کا اضافہ کیا ہے۔ افریقہ —— افریقہ...... ہرے ہرے طوطوں اور لمبی گردن والے زرافہ کا افریقہ نہیں۔ اُس وحشی فطرت والے افریقہ کے بارے میں تو بہت سے لوگ اپنی باتیں سناتے ہیں اور قصے بیان کرتے ہیں۔ جوگندر پال ان انسانوں کا ذکر کرتا ہے، جنہیں لوگ افریقی بلکہ حبشی کہتے ہیں، جن کے کردار اور اوصاف کے بارے میں غلط روایتیں اور حکایتیں ہمارے ذہن میں لبادی

گئی ہیں۔ جوگندر پال نے نئے ماحول کے نئے انسانوں کا ذکر کر کے افریقہ کے بارے میں اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائی ہیں اور بہت سی غلط باتوں کی تردید بھی کی ہے۔ اس ضمن میں وہ اردو کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے افریقی زندگی کو اس شدت اور خوبی سے ہم سے روشناس کرایا ہے۔

جوگندر پال کا ایک نقطۂ نظر بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کا کوئی زاویۂ نگاہ نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ "ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا اور چل نکلے" ـــــ حالانکہ یہ بھی ایک زاویہ نگاہ ہے مگر بے حد سطحی ہے جوگندر پال بھی دیکھتا ہے، دل شاد بھی کرتا ہے اور دیکھ کر چلا بھی جاتا ہے، مگر دیکھ کر جانے کے بعد بھی ہم اُس کے افسانے کا مزہ لیتے رہتے ہیں، کیونکہ تصویر جو اُس نے ہمیں دکھائی ہے اُس میں صرف سطح کی کیفیت نہیں ہے، جیسی اکثر تصویر دل میں ہوتی ہے۔ اُس میں اور تہیں بھی ہوتی ہیں جنہیں ذہن آہستہ آہستہ کھولتا ہے اور تہ بہ تہ کا مزہ لیتا ہے! اُس کے افسانوں سے ایک ہمدرد افسانہ نگار کا دل جھانکتا ہے، ایک انسانیت پرست نر جو اپنے گردوپیش کے حالات سے محض متاثر ہی نہیں ہوتا کیمرہ کی حساس پلیٹ کی طرح۔ بلکہ اُن حالات کو بدلنے کا شعور اور اُس شعور کا درد اور تڑپ بھی اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ بہت سے ادیبوں کے سینے میں محض کیمرے کی ایک پلیٹ رکھی ہوتی ہے اور دل کی جگہ ایک ٹائپ رائٹر ہوتا ہے۔ یہ جوگندر پال کی خوش

قسمتی ہے کہ وہ ایسا ادیب نہیں ہے۔ اُس کا ایک زاویہ نگاہ ہے جو انسان کی بہتری اور بہبود سے متعلق ہے اور وہ اپنے قلم کی ذمہ داری سمجھتا ہے۔

جوگندر پال ایک نوجوان ادیب ہے یعنی بہ الفاظ دیگر نئی نسل کا ادیب ہے۔ حالانکہ میں نئی نسل یا پرانی نسل کا قائل نہیں ہوں، میں صرف اچھی نسل کا قائل ہوں۔ کچھ لوگ پچیس برس کی عمر ہی سے اچھا لکھنے لگتے ہیں اور کچھ لوگوں کو پچاس برس کے بعد اعلیٰ ادب کی تخلیق نصیب ہوتی ہے۔ ادب میں دونوں طرح ہی کی مثالیں موجود ہیں، اس لئے کسی کے ادب کو پرکھنے کے لئے اس ادیب کی عمر کو نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو اُس نے لکھا ہے وہ اچھے ادب کے معیار پر پورا اترتا ہے؟

جوگندر پال چونکہ انگریزی ادب کا رسیا ہے لہٰذا اس لئے اپنے فن کے سلسلے میں انگریزی ادب سے اور انگریزی ادب کی وساطت سے مغربی ادب سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے جیساکہ ہم سب نے سیکھا ہے۔ مگر اپنے زاویہ نگاہ کے سلسلے میں وہ مغرب سے قطعی مرعوب نہیں۔ تاہم جب اپنے ادب میں ملایا کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ملایا عبارت ہے انگریز پلانٹر سے اور انگریز سرمایہ دار سے، حالانکہ یہ ملایا کی غالب حقیقت نہ کبھی تھی نہ ہے۔ تاہم ایسے حساس اور بڑے فنکار نے کبھی مشرق کی زندہ اور بدلتی ہوئی بڑی حقیقتوں سے آنکھیں چرائی ہیں جس طرح آج مغرب کے دوسرے بڑے اور چھوٹے فنکار اکثر و بیشتر دنیا کی بڑی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں کیونکہ اس ضمن میں ان کا ذہن مجرم ہے، کیونکہ آج دنیا

کی تمام بڑی حقیقتیں ادب سے سائنس اور سائنس سے سیاست تک اُن کی مرضی کے خلاف بدلی جارہی ہیں۔ وہ اُن کا سامنا نہیں کر سکتے لہٰذا آنکھیں چُرا کر دروں بینی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جوگندر پال نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا ذہن مجرم نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بڑی آسانی سے اپنے ماحول کی پردہ داری کر سکتا تھا اور گہری حقیقتوں کو نظر انداز کر کے سطحی حقیقتوں کے رنگ و عیب کو اپنے فنی نقوش سے ابھار سکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا ہے اور ایسا نہ کرتے ہوئے جرأت سے کام لیا ہے۔

جوگندر پال کا ماحول مشرقی افریقہ کا ماحول ہے۔ مشرقی افریقہ کے لوگ پٹھانوں کی طرح سیدھے سادے اور غیر پیچیدہ نفسیات کے حامل ہیں۔ وہاں اگر فطرت وحشی ہے تو انسان بھی بچوں کی طرح معصوم اور بھروسہ کرنے والے ہیں۔ اُس دنیا میں مغرب سے کچھ لوگ گئے ہیں، انھوں نے وہاں نئی بستیاں آباد کی ہیں، ریلیں بچھائی ہیں، کانیں کھدائی ہیں، جنگل صاف کیے ہیں، گھاٹیوں میں کھیتیاں آباد کی ہیں اور اس عمل کے دوران میں انھوں نے مشرقی افریقہ کو افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح اپنا محتاج بنا لیا ہے اس طرح کہ اب نہ ان کی زمین اپنی ہے، نہ ملک اپنا ہے، نہ اُس کا نظام اپنا ہے اور وہ خود اپنے دیش میں رہتے ہوئے باہر والوں کے دست نگر ہیں، جن میں کچھ ہندوستانی بھی شامل ہیں جو چھوٹے پیمانے پر افریقی زندگی سے استحصال کرتے ہیں۔ یہ چند بنیادی باتیں ہیں مشرقی افریقہ کی زندگی کی، جنہیں نظر انداز کرنا زندگی کی اہم ترین حقیقتوں سے

آنکھیں چرا تا ہے۔

جوگندر پال بڑی آسانی سے امیر غیر ملکیوں کی جگمگاتی ہوئی زندگی کے مطالعے میں اپنے آپ کو کھو سکتا تھا، اس طرح کہ داستان کا لطف بھی حاصل

ہو جائے اور خود غرض حقائق کی پردہ پوشی بھی ہو جائے۔ داستان کا لطف تو اس نے اب بھی پورا پورا

برقرار رکھا ہے، کیونکہ وہ مغربی فن کا بڑا قائل ہے۔ Suspense کہیں اسے بڑا مزہ آتا ہے اور Suspense کے بعد جھٹکا دینا بھی خوب جانتا ہے آخر میں اور ضرورت سے زیادہ ایک فقرہ نہیں لکھتا اور میرے ایسے پرانے افسانہ نگاروں کی طرح افراط کا قائل نہیں معلوم ہوتا، یعنی افسانہ نگاری کے فن کو برتنا خوب جانتا ہے اور اس ضمن میں اُسے کسی سے سیکھنا نہیں ہے۔ اس کے باوجود اُس نے اپنے فن کے لئے ایک مشکل راستہ اختیار کیا ہے۔ اُس کی تمام تر ہمدردیاں منافع اندوز غیر ملکیوں اور خود اپنے ہم وطنوں کو چھوڑ کر ان غریب افریقیوں کے ساتھ ہو جاتی ہیں جن کا وہ ملک ہے اور جس کی آزادی وہ لوگ حاصل کر کے رہیں گے۔

کیسے وہ لوگ ہیں؟ کیسی اُن کی زندگیاں ہیں؟ کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں؟ کیسے محبت کرتے ہیں؟ کیسی ان کی دھرتی ہے، کیا اُس کا روپ رنگ ہے؟ اُن کے پرانے جنگلوں میں نئی تہذیب کیا لے کے آئی ہے؟ ان تمام باتوں کی حیرت انگیز داستان مجھ سے نہ سُنئے، جوگندر پال سے سُنئے جو اُس نے نہایت خوبصورتی سے، صناعی سے اور حسن کاری سے زیر نظر مجموعے کے افسانوں میں بیان کی ہے۔ اس طرح کہ افریقہ کی بوقلموں زندگی اپنے ہفت رنگ کیف و کم کے ساتھ آپ کی

آنکھوں کے سامنے آباد ہو جاتی ہے۔

کرشن چندر

معجزہ

جب میں نے سڑک کی بائیں طرف ایک کچّے راستے کے قریب کار روکی تو ادھر اُدھر سے سات آٹھ گندے گندے افریقی بچّے ہمارے آس پاس آ جمع ہوئے۔

"یہاں سے آپ کو جھیل تک پیدل چلنا ہوگا، بوانا" ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔

ہم سب بڑبڑاتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلے، پکنک کا سامان باہر نکالا اور خالی گاڑی کو لاک کر کے پیدل چلنے کی فکر کرنے لگے۔ دو افریقی لڑکوں نے کچھ کہے سُنے بغیر جلدی سے آگے بڑھ کر ہمارا سب سامان اٹھا لیا۔ گویا وہ بخوبی جانتے ہوں کہ ہمارا بوجھ اٹھانا ان ہی کا کام ہے۔ دوسرے بچّے ناک پر بازو رگڑتے یا سر کھجاتے ان خوش نصیبوں کی طرف حسرت سے دیکھنے لگے جو ہمارا سامان اُٹھائے ہشاش بشاش اور مستعد ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔

"ان پر ذرا نگاہ رکھیو جی،" میری بیوی انھیں محتاط نظروں سے دیکھتی ہوئی

ہرلیش کے گلے پر مفلر ٹھیک کرنے لگی۔

ننھا ٹیٹو مچلنے لگا کہ اُسے اٹھا لیا جائے۔ ایک اور افریقی لڑکے نے موقع پاتے ہی آگے بڑھ کر اسے بڑے پیار سے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور نہایت شادمانی سے اپنے ساتھیوں میں جا کھڑا ہوا۔ جو بڑی فخرمندی سے ہمارا بوجھ اٹھائے شاید سوچ رہے تھے کہ آج اگر آدھ آدھ شلنگ کی کمائی ہو جائے تو ہمارے ماں باپ کتنے خوش ہوں گے، پیار سے ہمیں گلے لگا لیں گے۔

آخر ہمارا یہ مختصر سا قافلہ جھیل پر پہنچنے کے لئے ڈیڑھ دو میل کے اس کچے راستے پر ہو لیا۔ میری بیوی نے ایک بار پھر مجھے ایسی نظر سے دیکھا گویا کالے چھوکروں سے باخبر رہنے کو کہہ رہی ہو" پورے فتنے ہوتے ہیں یہ لڑکے، اگر ہشیار نہ رہے تو آنکھوں میں دھول ڈال کر سارا سامان اڑا لے جائیں گے۔"

"ماں جی، کرتار کے رنگ دیکھئے ذرا" میری بیوی ماں جی سے ہمیشہ ان ہی کے لب و لہجہ میں بات کرتی" یہ جھیل ہے نا؟ اوپر زمین ہے اور نیچے پانی ہی پانی" وہ انھیں کئی بار یہی بات بتا چکی تھی" اور جب آپ اس پر چلتے ہیں تو زمین ہلتی ہے۔ یوں!" اس نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر نیچے کرتے ہوئے کہا" کرتار کے رنگ دیکھئے ذرا۔"

اور ماں جی نے حسبِ عادت جواب دیا" ست نام سری واہگورو!"

میرا چھ سالہ لڑکا ہرلیش ایک افریقی چھوکرے سے پوچھ رہا تھا" تم کونسی جماعت میں پڑھتے ہو؟"

افریقی چھوکرا کچھ جواب دینے کی بجائے پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ شاید یہ سوچنے لگا کہ اگر وہ بھی چیفو کے ساتھ اسکول میں داخل ہو جاتا تو اب کس

جماعت میں ہوتا۔

"ہم پڑھ لکھ کر کیا کریں گے بیٹا؟" شاید اس کے کانوں میں اپنے باپ کا سیدھا سادا جواب گونجنے لگا۔ "مونگڑ نے ہم لوگوں کو کام کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ پڑھنا لکھنا تو بیکار آدمیوں کا کام ہے۔ جا اپنا کام کر۔"

"جا اپنا کام کر!" جیسے یہ سن کر افریقی چھوکرا چلتے چلتے ذرا رک گیا۔ بھلا کر اپنے باپ سے یہ کہنے کے لئے "بابا کام ہی تو کر رہا ہوں۔"

وہ بائیں ہاتھ میں ہماری فروٹ کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھے اور دائیں میں ٹفن کیریر۔ اچانک ٹوکری سے پکا ہوا ایک سرخ سیب نیچے آ گرا۔

"دھیان سے اٹھا موئے۔" میری بیوی کی شعلہ بار آنکھیں لڑھکتے ہوئے سیب کا تعاقب کرنے لگیں۔

رینا نے لپک کر سیب اٹھا لیا اور اس پر اپنے تیز تیز دانت گاڑ دیئے۔ "بڑا میٹھا ہے، ممی۔"

لڑکی کے منہ میں سیب کو محفوظ پا کر میری بیوی پھر اطمینان سے ماں جی کی طرف متوجہ ہوئی "ماں جی، سیبوں کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔ یہی سیب میں دو شلنگ پونڈ لایا کرتی تھی، اب تین شلنگ سے کم قیمت پر کوئی ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتا۔"

"ممی، سیب زمین پر کدو کی طرح اگتے ہیں، یا آموں کی طرح درختوں پر؟" رینا نے پوچھا۔

"جہاں میں رہتا ہوں"۔ افریقی چھوکرا ہرلش کو بتانے لگا۔ "وہاں بڑے بڑے

سیبوں کے انگنت درخت ہیں۔"

"اچھا!؟"

"ہاں، اگر تم ساری عمر بھی کھاتے رہو تو ختم نہ ہوں" افریقی چھوکرا شاید سوچ رہا تھا کہ سیب کا ذائقہ کیا ہوتا ہے "وڈو نگو انھیں بوریوں میں بند کر کے شہر بھیج دیتا ہے"۔

"تم لوگ بہت سیب کھاتے ہو گے؟"

"نہیں ہم مکئی کا آٹا ابال کر کھاتے ہیں۔ میرا بابا کہتا ہے کہ یہ بہت مزیدار ہوتا ہے ــــــ"

"ست نام سری واہگورو!"

جھیل تک پہنچنے کے لئے اب ہم بائیں طرف ایک تنہا پگڈنڈی پر ہو لئے جہاں انسانوں کی بجائے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگتے نظر آتے تھے۔ تاریک براعظم کی دیگر بے شمار اجڑی پگڈنڈیوں پر رینگتے ہوئے انواع واقسام کے دوسرے کیڑوں کی مانند جو اجنبیوں کے پاؤں تلے روندے جاتے ہوئے چیخے بغیر دم توڑ دیتے ہیں۔

چار پانچ سال پہلے انتہا پسند کالوں کی ایک خطرناک جماعت نے اس علاقے میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا جیسے کئی بار کیڑے بے چین ہو ہو کر کلبلانے لگتے ہیں مگر تابہ کے؟ اب تو یہاں موت کا سناٹا ہے جو وِیک اینڈ کی چند پکنک منانے والے اجنبیوں کے قہقہوں سے مزید گھنا معلوم ہونے لگتا ہے۔

دفعتاً ایک کیڑے نے مجھے ٹخنے پر کاٹ کھایا، میں نے درد سے بلبلاتے ہوئے اسے بڑی بے رحمی سے دیکھا اور مسل کر پرے پھینک دیا۔

"ماں جی، کبھی یہ علاقہ بڑا خطرناک تھا۔" میری بیوی ماں جی کو سمجھانے لگی "کالے مشٹنڈوں نے یہاں اپنا گڑھ بنا رکھا تھا خود ہی کرنیل جرنیل بن بیٹھے تھے۔ بڑے ظالم تھے، وہ تو بھلا ہو سرکار کا، جو ایک ایک کو ڈھونڈ نکالا، ورنہ ہم سب پر آفت آجاتی بنے بنائے کام چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔"

"ممی" سریش نے سینہ تان کر کہا "میں بڑا ہو کر جرنیل بنوں گا، اور یوں پستول چلاؤں گا ـــــ ٹھا!" اس نے انگلی سے پستول بنا کر ایک افریقی چھوکرے پر نشانہ باندھتے ہوئے زور سے ٹھا کہا۔

"ہاں بیٹا، شاباش! ماں جی، یہ لوگ آہو روتو مانگتے ہیں مگر کوئی ان جنگلیوں سے پوچھے کہ آہو روے کر کیا کریں گے۔ پہلے ذرا پڑھ لکھ تو لیں۔ راج پاٹھ کا کام چلانا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں بیٹی، تم سچ کہتی ہو۔ انگریجوں کا راج کھرا بہت ہے۔"

"ہم نے بھی اپنے دیش کی آزادی کے لئے بہت جتن کیا۔" گویا میری بیوی اپنے آپ کو سمجھانے لگی، "مگر ہماری بات دوسری ہے۔ ہمارا اور ان گنواروں کا کیا مقابلہ؟ ذرا سوچئے ماں جی، ہمارا کلچر ــــ کلچر یعنی دھرم کتنا پرانا ہے، انگریزوں کے دھرم سے بھی کئی ہزار سال زیادہ پرانا۔ ماں جی، ان لوگوں نے تو آج ہی بم بنانے سیکھے ہیں مگر رامائن میں لکھا ہے کہ صرف ایک رام بان سے ہی سارے سنسار میں پرلے آسکتی ہے۔"

"ست نام سری واہگورو! تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی۔ ہمارا دھرم تو مہان ہے۔ ہندو دھرم تو بڑا اپن کرنے سے ملتا ہے۔ اسی لئے تو میں بوئی کو رسوئی میں قدم نہیں رکھنے

دیں۔ نہ جانے یہ لوگ کون کون سا کچا پکا گوشت کھاتے رہتے ہیں۔"

اتنے میں ہمیں سامنے سے اچھل اچھل کر آتا ہوا ایک ہٹا کٹا ننگ دھڑنگ نوجوان افریقی نظر آیا جو بائیں ہاتھ میں ایک بہت بڑی چھری پکڑے ہوئے تھے، دھوپ میں چمکتی ہوئی، نہایت تیز دھار والی اور سرخی مائل جیسے ابھی ابھی اس پر سے خون پونچھا گیا ہو۔

خوفزدہ کپکپاہٹ محسوس کر کے میں منہ گول کر کے سیٹی بجانے لگا۔

"جامبو!" جب وہ ذرا قریب آیا تو میں نے بدستور ڈرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"جامبو، بوانا!" اس کی آواز میں کسی مست جنگلی ہاتھی کی چنگھاڑ تھی "دیکھنے آئے ہو؟"

"ہاں!" میری آنکھیں ابھی تک اس کی چھری پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہاں قریب ہی ایک وزونگو کا فارم ہے بوانا" مانو اس ان پڑھ گنوار نے میرے خیالات فرفر پڑھ لئے ہوں۔ "وہ کبھی کبھی اپنی بھیڑیں مجھ سے ذبح کروایا کرتا ہے بڑی پلی ہوئی بھیڑیں ہیں اس کی۔" ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جب اس نے میری طرف گرسنہ نظر اٹھائی تو مجھے یوں لگا جیسے بس میں بھی کوئی نہایت پلی ہوئی لذیذ بھیڑ ہوں۔

"سگریٹ پیو گے؟" اپنے لئے سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے سچ مچ چھری کے نیچے بندھی ہوئی کسی بھیڑ کی مانند ممیایا۔

"نہیں بوانا، ایسے شوق ہم غریبوں کے لئے نہیں ہوتے۔ ہاں اگر دو چار سینٹ دے دو تو ٹھیک ہے، جامبو، ماما مفنے۔ جامبو، ماما ڈوگو" مجھے جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ کر اس نے ماں جی اور میری بیوی سے بڑے ادب سے کہا۔

"سائنٹ بوانا کوبا! سائنٹ سانا" مجھ سے سموئی پیتے ہوئے جنگلی ہاتھی اپنی چنگھاڑ بھول کر کسی پالتو کتے کی طرح خرخر کرنے لگا۔ اور میں نے نہایت اطمینان سے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے قدم آگے بڑھا لیا۔

ہماری ٹھوکریں کھا کھا کر آخر پگڈنڈی نے ایک جگہ دم توڑ دیا۔

"یہی لیک کیکوتو ہے!"

ہمارے سامنے نیچے کی طرف گیلی گیلی دھرتی کا ایک وسیع ٹکڑا گویا ہماری بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو کر کسی بچے کی طرح روتے روتے ہنس دیا۔

"ہاں بوانا کوبا، یہی لیک کیکوتو ہے۔ اوپر زمین ہی زمین نظر آتی ہے اور نیچے کئی میل گہرا پانی ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔" اس عجیب بات کو دیکھتے ہوئے میری نگاہیں ایک اور عجیب بات پر پھسلنے لگیں۔ وہ کوئی امریکی لڑکی معلوم ہوتی تھی اور اپنے دو چار ٹورسٹ ساتھیوں کے ہمراہ جھیل پر اچھل کود رہی تھی "کتنی عجیب بات ہے!"

"وہ دیکھیے، کئی جگہوں پر پانی سے بھرے ہوئے گڑھے نظر آرہے ہیں، کئی گڑھے ایک آدھ گز پر زمین کی تہہ سے ڈھکے ہوئے ہیں مگر کئی ایسے بھی ہیں جن میں گر کر آدمی کا نشان تک نہیں ملتا۔"

ہمارے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر گجراتی جوڑا بیٹھا تھا۔ مرد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ کالا چھوکرا لوگ لیک کا چپہ چپہ جانتا ہے، ایک گڑھے میں اتر کر دوسرے سے باہر جا نکلتا ہے۔"

"اچھا!"

"اگر تم ان گڑھوں میں کنگوترہ پھینکے گا تو یہ لوگ پھورن نکال لائے گا" گجراتی سیٹھ نے اپنے کوٹ کے اندرونی گڑھے میں ہاتھ ڈالا، شاید یہ سوچ کر کہ کہیں اس کا بٹوہ نہ نکال لیا گیا ہو "سالا بڑا ہوشیار لوگ ہے"

ہم سب بھی وہیں ڈیرا جمانے کی تیاری کرنے لگے۔

"تم ان گڑھوں کے اندر اتر سکتے ہو؟" میں نے ایک افریقی لڑکے سے پوچھا۔

"دو سال ہوئے اس کا بڑا بھائی ایک شلنگ کے لئے وہاں جا اترا" ایک اور کالا لڑکا پیچھے بتانے لگا "وہاں اس گڑھے میں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا بدن جھیل کے اندر دھنس گیا، نہ جانے کہاں غائب ہو گیا"

چھوٹے بھائی کی آنکھوں سے پانی کی ایک دھار پھوٹ آئی جیسے اس گیلی دھرتی پر جگہ جگہ گھاس کے نیچے ان گنت دھاریں پھوٹ رہی تھیں۔

"تمہیں نیچے جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں بوانا" سب نے ہنس ہنس کر کہا۔ وہ چھوٹا بھائی بھی آنسو پونچھ کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ "نہیں بوانا!"

"ست نام سری واہگورو!"

"چلو بیٹھو، سب روٹی کھاؤ، پھر تمہیں نیچے جھیل میں لے جائیں گے" میری بیوی نے بچوں سے کہا اور ٹفن کیریر کھول دیا۔

"پیدل چل کر میری بھوک تو بہت چمک اٹھی ہے"۔ میں نے جلدی جلدی روٹی میں انڈوں کی سبزی رکھ کر اس کا سینڈوچ بنایا اور نگلنے لگا۔

"اتنی جلدی کیا پڑ گئی ہے؟ بالکل بچے ہیں آپ بھی"

تیز تیز کھاتے ہوئے میری نظر اچانک ان افریقی بچوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ چپ چاپ بوڑھے سے نظر آتے ہوئے ایک طرف بیٹھے ہماری جانب تک رہے تھے جب بچوں کا بوڑھا بننا معیوب نہ ہو تو بوڑھوں کا بچے بن جانا بھی عین مناسب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے بالکل کسی بچے کی مانند ضد کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا "نہیں یہ سبزی تھوڑی ہے اور دو!"

جب ہم سیر ہو کر کھا چکے تو برتن صاف کرنے سے پہلے افریقی لڑکوں نے ہمارا بچا کھچا آپس میں بانٹ لیا۔

"اس سے ان بیچاروں کا کیا بنے گا؟" میں نے اپنی بیوی سے کہا "وہ مٹھائی بھی انھیں دے دو"

"تھوڑی دیر میں بچوں کو پھر بھوک لگی تو انھیں کیا دوں گی"

"بہت دیالو معلوم ہوتے ہو، بابو" گجراتی سیٹھ کہنے لگا۔

"جی؟!" میں نے ایسی شکل بنائی جیسے واقعی اس کے الفاظ کو سن نہ پایا ہوں۔

"میں نے کہا تم بڑے دیالو نظر آتے ہو"

پیٹ بھر جانے کے بعد اگر کوئی تعریف کرنے والا مل جائے تو دل اپنے آپ خوشی سے بھر کر جھوم اٹھتا ہے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سیٹھ جی، میرا بیٹیا تو ذرا سست جگی ہے"

میری بیوی نے مٹھائی کا لفافہ سنبھال کر بڑے ٹوکری میں رکھ دیا اور میں نے ذہنی لذت محسوس کرتے ہوئے مسکرا مسکرا کر اپنے آپ سے کہا کہ سیٹھ ٹھیک

کہتا ہے، ہاں جی بھی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔

پھر میں ذرا سستانے کے لئے نیم دراز ہو گیا، سگریٹ سلگایا اور سیٹھ جی سے بہت پیار سے ہلکی سی آواز میں پوچھا "آپ نیروبی میں کہاں رہتے ہیں سیٹھ جی؟"

تھوڑی دیر میں بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ پیچھے جھیل میں چلیں۔

جب ہم نے جھیل کی دھرتی پر قدم رکھے تو اسے ہلتا ہوا پا کر ہمارے دل بھی ذرا ذرا ہلے لیکن ہم بظاہر مسکراتے ہوئے بڑھتے گئے، پہلے ہولے ہولے احتیاط سے، پھر کچھ دور جا کر ڈر دور ہوا تو تیز تیز، اور پھر اوروں کو اچھلتے کودتے دیکھ دیکھ کر ہم بھی بے پروائی سے دوڑنے لگے۔

"بڑی عجیب بات ہے" میں کسی اسکول کے بچّے کی مانند لرزاں زمین پر اچھلنے لگا۔

"یہ لیک بھی قدرت کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ دیکھو!" میں اپنی بیوی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے بہت سرعت سے اُچھلا۔ میرے قدموں کے نیچے دھرتی یوں کانپی جیسے کسی افلاس زدہ افریقی کا دل۔ جس پر بیسیوں آلام پھدک، پھدک کر قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔

کسی ایشیائی تاجر کے شاندار بنگلے میں دن رات کام کرتا ہوا یہ بھولی "اُف مجھے اپنی ننھی ترائی سے ملے آج پورے دو برس ہو گئے ہیں۔ اب وہ کیسی لگتی ہوگی؟!"

کسی فارغ البال انگریز نوآباد کی تصاویر کی نمائش گاہ میں نہایت محنت سے تصویریں ٹانگتا ہوا یہ کالا مزدور! "یہ کام تو آج شام کو ہی ختم ہو جائے گا۔ کل کیا کروں گا؟"

ٹکنیکل کالج میں تعلیم پاتا ہوا کسی مفلس افریقی گھرانے کا یہ ہونہار سپوت!

"میاؤں، اگر تم کل بھی فیس نہ لائے تو تمہارا نام کالج کے رول سے کاٹ دیا جائے گا۔" میاؤں کسی کتے کی طرح بھونکنا چاہتا تھا، مگر بیچارا مسکین بلی بنا دودھ کی خالی ہنڈیا چاٹتا رہا۔ "میاؤں ـــــ میاـــ ؤــــں!"

میری بیوی مجھ سے کہہ رہی تھی: "یہ تجربہ آپ کو دنیا بھر میں کہیں نہ ملے گا۔ دراصل اس کا یہ مطلب تھا کہ میرے ہی ماں باپ نے آپ کو اس ملک میں منگوایا تھا، ورنہ آپ کو ایسے عجوبے دیکھنے کہاں نصیب ہوتے؟" "دیکھئے نا!" وہ بھی جھیل کی کانپتی دھرتی پر زور سے اچھلی۔

"ہائے رام!" یکایک وہ ہرلیش کی چیخ سن کر تیزی سے پلٹی۔ بھاگتے بھاگتے ہرلیش ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا تھا۔

گڑھے کے اونچی اونچی گھاس سے سر اٹھا کر گویا نہایت مودب انداز میں ہم سے کہا "گھبرائیے نہیں ہم چھوٹے چھوٹے ادنیٰ گڑھے بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

ہمارے ساتھ آیا ہوا ایک افریقی لڑکا لپک کر ہرلیش کو گڑھے سے باہر نکال لایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی ملتجی آنکھوں سے کہا "صاب بخشیش؟"

میں نے تانبے کے دو چار سکے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"ستنام! شکر ہے تیرا کرنی والے! بیٹا آج ہی بھگوان کے مندر میں ایک من اناج دے آنا۔"

"چلئے اب واپس چلتے ہیں۔" میری بیوی نے ہرلیش کو اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ رکھا تھا۔

"ماں کوکا کولا" ہریش نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"نہیں ایسا بھی کیا خطرہ ہے۔ آگے نہیں جانے گھڑی بھر کے لئے یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

ہم سب وہیں ایک طرف کٹی ہوئی صاف گھاس پر بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں ہمیں کچھ فاصلے سے امریکی ٹورسٹ لڑکی کی باریک اور شیریں آواز سنائی دی۔ "یہ گڑھا کتنا گہرا ہے؟"

"بہت گہرا ہے میم ساب، بہت گہرا۔" ایک افریقی لڑکے نے اسے جواب دیا۔

"لو، ہم اس میں ایک شلنگ پھینکتے ہیں۔ ایک، دو، تین۔ اور یہ لو جاؤ اور نکال لاؤ۔"

"نہیں میم صاحب، یہ بہت گہرا ہے۔"

سب امریکی ٹورسٹ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے اور وہ افریقی لڑکا تنہا وہیں کھڑا لالچی نظروں سے اس گڑھے میں جھانکتا رہا۔ نو شلنگ! نو شلنگ!! وہ کچھ دور جا کر پھر وہیں پلٹ آیا۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے کالے چھوکرے بھی اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان سب کی سہمی سہمی آنکھیں گڑھے کی گہرائی ناپ رہی تھیں۔ اس انجانی گہرائی میں نو چمکیلے سکّے ڈھونڈ رہی تھیں۔

آخر سب لڑکے نہایت مایوسی اور تاسف سے سر ہلا ہلا کر وہاں سے چلے آئے، مانو امریکی لڑکی کی بجائے خود ان ہی کا نو شلنگ کا نقصان ہو گیا ہو۔

"ماں کوکا کولا!"

چار پانچ منٹ میں مجھے اپنا ایک نوجوان واقف کار مسٹر لیش ویر اپنی بیوی

کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔

"ہیلو" میں نے اسے پکارا۔

"ہیلو، کیا حال ہے؟"

"کہئے، سنڈے منایا جا رہا ہے۔ آئیے، بیٹھیے"

"نہیں، ذرا گھومتے ہیں" لیکن جب اس کی بیوی میری بیوی کے پاس بیٹھ گئی تو وہ بھی میرے قریب آ بیٹھا۔

"کہئے دل تو خوب لگ گیا ہے نا؟" لیش ویر چند ماہ پہلے کینیا میں پہلی بار آیا تھا اور نیروبی کے کسی اسکول میں ٹیچر تھا۔

"یہاں تو اپنے آپ دل لگتا ہے جی۔ دیکھئے چاروں طرف کیا فرسٹ کلاس نظارے ہیں" پھر اس نے اپنے لہجے میں دانائی پیدا کرتے ہوئے کہا "مگر ایک بات ہے۔ اس ملک کی کلچرل اور سوشل لائف بڑی پور ہے۔ ہمارے شہروں جیسی بات نہیں"

مسز لیش ویر میری بیوی سے کہہ رہی تھی "مسٹر ویر انڈیا کے لڑکوں کی طرح نہیں دیکھئے کتنے سمارٹ ہیں، بالکل یہاں کے لڑکوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں" مسز لیش ویر یہیں پیدا ہوئی اور پلی تھی۔ اُس کے باپ کو جب یہاں اپنی بیٹی کے لئے کوئی پڑھا لکھا اور مناسب ور نہ مل سکا تو وہ اسے شادی کے لئے انڈیا لے گیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" میں نے لیش ویر سے کہا۔ "یہاں کا تہذیبی معیار واقعی بہت پست ہے" جیسے یہ کہہ کر میں نے لیش ویر کو یقین دلانے کی کوشش کی ہو کہ میں خود بڑا تہذیب یافتہ ہوں۔

"وِنے صاحب، آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں" لیش ویر کہنے لگا "کبھی ملا

کیجئے، یہاں تو سمجھ بوجھ والے آدمی نظر ہی نہیں آتے۔"

"ہاں، ہاں، ضرور!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ونے صاحب آپ کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں۔ وہ میرے پرانے دوست ہیں۔ دلی میں وہ اور میں ہر شام کو چاٹ کھانے کے لئے چاندنی چوک جایا کرتے تھے۔"

"وہاں کی چاٹ کی کیا بات ہے جی! آدمی سارا دن کھاتا رہے مگر جی نہیں بھرتا۔ دیکھئے نا، اب یہاں کوئی کام کی چاٹ بھی نہیں بنا سکتا۔ یہ بھی کوئی ملک ہے؟"

"یہاں کی بات چھوڑیئے آپ، یہ لوگ تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تنخواہ یہاں کی ہو، اور رہنا دلی کا۔ مزا آجائے۔"

"واقعی مزا آجائے۔ آتے ہی مجھے آٹھ سو شلنگ ماہوار ملنے لگے ہیں۔"

"ہاؤس الاونس ملا کر مجھے آج کل چودہ سو ملتے ہیں۔" میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا تاکہ اس کی بیوی بھی سن لے۔

"مگر بہن" میری بیوی مسز لیش ویر سے کہنے لگی "پتہ نہیں لگتا اتنا پیسہ جاتا کہاں ہے۔"

میرا ذہن گھڑی بھر کے لئے بینک بیلنس کے ہندسے گننے لگا۔ "لیش ویر جی، آپ سچ کہتے ہیں۔ یہاں کے جیون میں وہ بات نہیں، وہ اعلیٰ کلچر نہیں۔"

میرے بیٹوں بچے ہمارے آس پاس ناچنے لگے۔ لیش ویر اسکول ماسٹر سا نظر آتے ہوئے انھیں آرام سے بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بھی کھڑا ہو کر ان کے ساتھ ساتھ اچھلنے لگا۔ دیکھا دیکھی ہم سب چھلانگیں مارنے لگے، ماں جی بھی بیٹھی بیٹھی اپنی ٹانگیں ہلانے لگیں۔ ہانپتے کانپتے دھرتی کا دم پھول گیا۔

"ہہ ہہ ہا — ہہ!"

افریقی بچے چپ چاپ ہمارے منہ تکتے رہے۔

"کیا معجزہ ہے!"

"واقعی ایسی جھیل ساری دنیا میں نہیں ملتی"

"دی ایٹتھ ونڈر آف دا ورلڈ!"

"چلئے اب ذرا آگے جا کر گھومتے ہیں" مسٹر لیش ڈیر نے اپنے شوہر سے کہا۔

"چلئے کنارے پر چلیں۔ کوئی اپنی چیزیں نہ اٹھا لے جائے، وہیں گھومیں پھریں گے۔" میری بیوی نے مجھے ہدایت کی۔

"ہاں چلو"

کنارے پر پہنچ کر ہم سب جمگھٹا سا بنا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ قریب ہی ایک درخت کے نیچے ایک ادھیڑ عمر افریقی اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔ میں اس کے نزدیک چلا آیا وہ کڑوی سی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں بڑے دوستانہ لہجے میں گویا ہوا — "ہمارے قدموں کے نیچے جھیل کی زمین تھر تھر کانپتی ہے — کتنا بڑا معجزہ ہے!"

اس نے نہایت خشک انداز میں جواب دیا۔

"مگر میں تو اسے ایک معجزہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے قدموں کے نیچے صرف جھیل ہی کی زمین کیوں کانپتی ہے۔ سارے افریقہ کی زمین کیوں نہیں کانپتی؟!"

"دوست نام سری داہگو رو!"

سب کا سوال

اور پھر وہ بے چین اور لرزاں سا مستقبل کے خنداں کناروں پر پھسلنے لگتا یہ مسکراتے ہوئے جاں لیوا عمودی کنارے، جن سے خیالی طور پر ہی گر کر انسان سسکے بغیر دم توڑ دیتا ہے۔ وہ تو کچھ اس کی روح میں دھیرے دھیرے تپ کر پکے ہوئے عزائم فوراً قدم بڑھا کر اسے تھام لیتے، ورنہ ایسی تند خواہشات کے نشے میں بہکتا ہوا غریب، مایوس آدمی تو خودکشی کرتے ہوئے بھی یہی سمجھتا ہے گویا حیاتِ جاودانی کسی شرمیلی دلہن کی طرح جھجک جھجک کر اس کی طرف بڑھنے لگی ہو۔ گویا اس کی تمناؤں کی تشنگی بجھنے کی گھڑی آخر آپہنچی ہو۔

اگر ملوزی کے عزائم بھی مایوس ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیتے تو اب تک یوں کھلا کر شاید وہ بھی خودکشی کر چکا ہوتا مگر اس کا اعتقاد تازہ دم رہا، ملوزی زندہ رہا۔ بہکتا رہا، اس شرابی کی طرح جسے معلوم ہو کہ وہ محض بہک رہا ہے۔ اور کچھ نہیں!

"میں — میں نے —" اس کی کپکپاتی آواز کو سنے بغیر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیونکہ گزشتہ پانچ برس سے میں یہی کہانی سنتا چلا آرہا تھا۔

"میں نے کچھ رقم تو جمع کر لی ہے اور کچھ اور دو چار سال میں کر لوں گا۔ پھر میں اپنے اس گھٹیا کام سے استعفیٰ دے دوں گا موانگی۔" اپنے "گھٹیا" کام سے استعفیٰ دے دینے کے خیال سے اس کی آواز میں مسرت دھڑک دھڑک کر بولنے لگتی۔ "ہاں، پھر میں استعفیٰ دے دوں گا اور بیرسٹر بننے کے لئے لندن چلا جاؤں گا، لنکنز ان (Lincoln's Inn) لندن۔" وہ ذرا رک جاتا۔ لنکنز ان، لندن میں اپنی خوشگوار مصروفیات کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔

"جب میں بیرسٹر بن کے لوٹوں گا اور لنکنز ان کا گاؤن پہنے بڑے بڑے مقدمات کی پیروی کروں گا تو سارا ملک میرے الفاظ کی صدائے بازگشت کو سن کر دانتوں پر انگلی رکھ لے گا۔ پھر تمہیں میری دوستی پر فخر ہوگا۔ بس اب دو چار سال ہی کی بات ہے پھر میں یہاں سے استعفیٰ دے دوں گا۔"

"موانگی، یار اپنا باس آج کل بہت ناراض رہتا ہے، سوچتا ہوں کہیں کسی دن واقعی نوکری سے جواب نہ مل جائے۔"

میں مسکرانے لگتا، وہ جھنجلا اٹھتا، جیسے اس کی تمنائیں بے بس، یتیم بچوں کی طرح رو اٹھی ہوں۔ مگر حسب معمول اس کا اندھا یقین ان بچوں کا حوصلہ بندھانے لگتا۔ "تم بھی شاید دوسروں کی مانند میرا مذاق اڑانے لگے ہو، موانگی، مجھے افسوس ہے کہ تم میری آنکھوں سے وہ روشن دن نہیں دیکھ سکتے ـــــ وہ روشن دن جن کا مجھے انتظار ہے، جنہیں میرے لئے آنا ہی ہوگا۔ جب میں اپنے باس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے جیوں گا۔ بیرسٹر بن کر انصاف اور قانون کی بقا کے لئے جیوں گا۔"

میرا احساسِ قنوطیت اس کے بھولپن سے شکست کھا کر چپ چاپ ایک طرف سرک جاتا اور ہم سر جوڑ کر گھنٹوں ان روشن دنوں کے چڑھتے سورج پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہتے۔ جہات پھر ہلکی ہلکی حدّت محسوس کرتے رہتے واقعی اپنے لئے جینے لگتے!

"کچھ جمع کر چکا ہوں" پھر یکبارگی ہم اپنی اصل دنیا میں لوٹ آتے، محکوم مظلوم اور بے تاب۔" اور کچھ کر لوں گا۔ پھر دیکھنا میرے یار"

میں دیکھتا رہا۔ بے سود دیکھتا رہا، مکوڑی کی داستان آگے بڑھنے کی بجائے انہی چپٹے ہوئے واقعات میں اُلجھی، کھسیانی سی ہنسی ہنستی رہی۔

ریلوے کے دفتر میں ہماری میزیں ساتھ ساتھ تھیں۔ اکثر یوں ہوتا کہ مکوڑی کام کرتے ہوئے رُک جاتا، اور سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر پر اپنی کھوئی کھوئی نگاہیں جما دیتا۔ تصویر میں سطح زمین پر کھڑے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک غریب افریقی بچّے کی مسرور نظریں ایک پہاڑ کی بلندیوں پر اچھل کود رہی ہوتیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچہ ابھی تیز تیز دوڑتے ہوئے ان بلندیوں تک پہنچ جائے گا۔ لیکن کئی سال سے ہم اسے وہیں کھڑا دیکھ رہے تھے۔ اس کی نگاہ کی مسرت جیسے اب اس کی بے چارگی کا مذاق اُڑانے لگی تھی۔

یہ پہاڑ، یہ بلندیاں! بے وقوف اتنی اونچائی تک پہنچنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ آؤ یہیں نیچے بھاگ دوڑ کر جی خوش کر لو ــــــ!

"نہیں، نہیں، میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ وہ دیکھو، وہاں، اُن چوٹیوں کے آس پاس!"

"بیٹا" فادر جیکب، ہمارا ایک نہایت شفیق انگریز ٹیچر، اکثر مکوزی سے کہا کرتا "تم بہت ذہین ہو، اگر تم ان چوٹیوں کے آس پاس پہونچنا چاہتے ہو تو خوب محنت کرو۔ آدمی جیسا بوتا ہے ویسا ہی پھل کھاتا ہے۔"

مکوزی نے بڑی محنت اور چاؤ سے اپنے لڑکپن کے سنہری سپنے بوئے تھے۔ جب اُس کے اسکول سرٹیفکیٹ کے امتحان کا نتیجہ نکلا تھا تو ان سپنوں کے بیج پھوٹ کر جھومتی ہوئی ننھی مُنی شاخیں اور ہرے بھرے پتّے بن گئے تھے۔ اپنے آپ کو فرسٹ ڈویژن میں پاکر وہ بہت خوش ہوا تھا مگر اپنے اس ننھے درخت پر پھل آنے سے پہلے وہ اپنی بھوک کیسے مٹا سکتا تھا، اس لئے وہ جانوروں کی مانند پتے ہی کھا کر گزارہ کرنے پر مجبور تھا۔ اگر وہ ریلوے میں کلرک نہ بنتا تو اس کے مرحوم باپ کا قرضہ کون چکاتا؟ اس کی بیوہ بہن اور بھانجوں بھانجیوں کی دیکھ بھال کون کرتا؟ کون جانے مکوزی کے لڑکپن کے سنہری سپنے کتنی بار رو دیئے مگر وہ پتّے کھاتا رہا، اپنے مرحوم باپ کا قرضہ چکاتا رہا، اپنی بیوہ بہن کے آنسو پونچھتا رہا۔ تاہم ان سب دھندوں سے فارغ ہو کر کبھی بار وہ چپکے سے اپنے دل کی کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوتا، پردہ سرکا کر اندر جھانکنے لگتا۔

یہ ہوائی جہاز لندن کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ یہ لندن ایرپورٹ ہے۔ یہ لنکنز ان ہے۔ لنکنز ان نہایت حوصلہ افزا و قانونی لہجے میں مسکرا مسکرا کر اپنے نئے طالب علموں کا استقبال کر رہی ہے۔ یہ کسی افریقن چیف کا خوش پوش لڑکا جس کا باپ نیرہ بستیوں پر حکومت کرتا ہے۔ یہ ایک دولت مند ہندوستانی تاجر کا بے فکر اسپوت، جس کی دونوں جیبیں نئے نئے کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ کسی افریقی انگریز افسر کا

منمول بیٹا، جو یہاں قانون پڑھ کر اپنے باپ سے بھی بڑا افسر بن جائے گا۔ یہ ایک اور۔ ایک اور۔ ایک اور۔۔۔ مگر ان سب میں مگوزی نہیں ہے۔ مگوزی، جو اپنے اسکول کا بہترین طالب علم تھا۔ تقریری مقابلوں میں جس کی تقاریر سن کر اساتذہ عش عش کرتے ہوئے کہہ اٹھتے تھے "یہ لڑکا تو پیدا ہی وکیل بننے کے لیے ہوا ہے" مگر جو لڑکے وکیل بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں وہ لنکنز ان میں قانون پڑھنے کے بجائے ریلوے کے کسی دفتر میں روٹین گریڈ کلرک ہو جاتے ہیں۔

مگوزی میرے قریب بیٹھا بڑی بڑی رقموں کی میزان کرتے ہوئے تھک کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا اور سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر پر اپنی گم شدہ نظریں جمائے نامعلوم کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

اسی دوران میں میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ہولے سے ٹکرا جاتیں۔ وہ جیسے شکست خوردگی کے احساس سے شرمندہ سا ہو جاتا "نہیں موانگی، میں نے ابھی ہمت نہیں ہاری۔ میں کبھی ہمت نہیں ہاروں گا۔ تم ذرا دیکھتے رہو۔"

پھر ایک دن اچانک ہیڈ کوارٹرز سے میری تبدیلی کا آرڈر آ گیا۔ وطن کی جانی پہچانی گلیوں سے چار سو میل دور ایک انجانا ساحل، جہاں پہنچ کر دھرتی ساگر میں غوطے کھانے لگتی ہے، اس کی لاش پانی میں میلوں نیچے ڈوب جاتی ہے۔

اسٹیشن سے گاڑی کی روانگی میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ میرے یار مگوزی کی گھنی، اداس خاموشی اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے ہوئے میرا منہ تک رہی تھی۔ "جاؤ موانگی، خدا حافظ۔ مگر۔۔۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اب اپنے دل کی باتیں کسے سنایا کروں گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا "مکوزی، میرے بھائی، دیکھو، بیرسٹری کو بھول جاؤ اور ہنسی خوشی مزے سے اپنی زندگی کے دن گزارو۔ جب ہم ادنیٰ لوگ بڑی بڑی خواہشات کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں تو ہماری عام خوشیاں بھی چھن جاتی ہیں ہم نامراد مر جاتے ہیں" میری یہ باتیں گھونسا بن کر جیسے اس کے دل پر جا لگی ہوں۔ اس کا خاموش اور بے زبان غم ڈبڈبا کر مجھ سے شکایت کرنے لگا۔

"مجھے معاف کر دو دوست مجھے واقعی افسوس ہے۔ میں تمہاری ہمت پر ناز کرتا ہوں، لیکن میں چاہتا یہی ہوں کہ تم ہمیشہ خوش و خرم رہو!"

وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا "تم فکر نہ کرو، موانگی۔ اب وہ دن دور نہیں جب تمہارا یہ دوست ہمیشہ قہقہے لگاتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ میری تقدیر اور توفیق کا سوال نہیں، میرے حوصلے کا امتحان ہے۔ ذرا مجھے اس امتحان میں پورا اتر لینے دو، دوست — کچھ جمع کر چکا ہوں اور کچھ اور —" گارڈ کا وسل چیخ چیخ کر اس کے پاگل پن پر ہنسنے لگا۔ اور میں اس سے وداع ہو کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے عزیزوں سے لمحاتی طور پر بچھڑنے کے بعد انہیں پھر کئی سال تک نہیں دیکھ پاتا۔ اتفاقات توقعات پر اس قدر حاوی ہو جاتے ہیں کہ انسان بے چارہ منہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ بھی تو اتفاق ہی کا ایک اوچھا مذاق تھا کہ اس روز جدا ہونے کے بعد بیس سال تک میں اپنے یار مکوزی سے نہ مل سکا۔ پہلی بار چھٹی پر وطن جانا ہوا تو وہ بھی کسی اور مقام پر تبدیل کیا جا چکا تھا۔ اسباب کچھ بھی ہوں بہرحال ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔

شروع شروع میں ہماری خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ جذبہ شوق کی

وہی بے ربط ادھوری کہانیاں، وہی آہنی ارادوں میں مقید بے چینیاں، وہی وارفتگی تکمیل خواہش کی منتظر سی۔ اس کی تحریریں انسانی جدوجہد پر چھوٹی چھوٹی رزمیہ نظمیں تھیں۔ میں بڑے شوق سے اس کی چٹھیوں کا انتظار کرتا رہتا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر میری شادی ہو گئی۔ بچے ہوئے۔ وہ بڑے ہو کر پڑھنے لگے۔ ایک تو پڑھ کر کام پر بھی لگ گیا۔ بیس سال گزر گئے!

پچھلے ماہ کی بات ہے کہ ہماری ٹیم ایک انگریز افسر کی سرکردگی میں چھوٹے چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں کا معائنہ کر رہی تھی۔ ایک روز جب ہماری گاڑی سرپٹ دوڑتی ہوئی لکیور ریلوے اسٹیشن کے قریب پہونچی تو نہ جانے کیوں ملکوزمی کی شکل بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ وہی بیس سال پہلے کا چہرہ، مستقبل کے جالے میں اٹکی ہوئی مخبوط الحواس نظریں، پرامید چہرے کی زردی، ذہین سیاہی، بے حد الجھے ہوئے گھنے گھنگریالے بال اور موٹے موٹے ہلتے ہوئے آئیڈیل افریقی ہونٹ۔

"ملکوزمی! میرے یار، تو کہاں ہے؟" میرا جی چاہا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، اڑ کر اس سے جا ملوں۔

اتنے عرصے تک اپنے دوست سے مجرمانہ تغافل برتنے کا خیال کر کے مجھے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ اب تک ملکوزمی اپنے پرانے پاگل پن کو قطعی بھول چکا ہوگا۔ اپنی حسرتوں کے گریاں راگ سے بے نیاز ہو کر اپنے حساس دل کے پھٹے ہوئے باریک پردوں کو سی چکا ہوگا۔ اپنے بچوں کے ساتھ بڑے مزے

سے گزر کر رہا ہو گا۔ بچپن میں کون ننھے منے ریت کے گھروندے نہیں بناتا مگر بڑا ہو کر کون ان گھروندوں کے متعلق سوچتا پھرتا ہے ؟

جب گاڑی جھٹکا کھا کر کلکیو ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو یدستور مکوزی کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی اس کا پتہ دریافت کر کے اس سے ضرور ملوں گا، اپنے باؤلے دوست سے!

گاڑی سے اترتے ہوئے ایک جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر میری روح گویا کسی مسرور پرندے کی مانند گا گا کر اچھلنے کودنے لگی میں لپک کر اس کے قریب پہونچا۔

"مکوزی!" میرا دل اچھل کر زبان پر آجانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے دیر تک چپ چاپ اسے اپنے سینے سے چمٹائے رکھا۔ چپ چاپ اپنی بے انتہا مسرت کو محسوس کرتا رہا، اپنی دھڑکنوں کو گنتا رہا۔ اپنی بے پناہ خوشی پر مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ دراصل کئی بار نئی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ہم عارضی طور پر اپنے قدیم راستوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن تقدیر اگر ہمیں اچانک پھر انہیں پُرانی راہوں پر لے آئے تو اس پُرانی مٹی کی خوشبو ہمارے دل و دماغ کو وجد آفریں مسرت اور پیار سے لبریز کر دیتی ہے۔

"تم —— ؟!"

"تم —— ؟!"

اس سے زیادہ خوشگوار اتفاق کیا ہو گا کہ ہماری اس طرح اچانک ملاقات ہو گئی اور وہ بھی عین اس وقت جب اتنے لمبے عرصے کے بعد میرے اندر دفعتاً

مکوزی کی خوابیدہ یاد انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

کیمبو ریلوے اسٹیشن مکوزی کے چارج میں تھا۔ اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر اس کا کوارٹر کھڑا اپنا دونوں ہاتھ پھیلائے میرا استقبال کر رہا تھا۔ اس کے بچے کوارٹر کے سامنے کھیل کود رہے تھے۔ اس کی ادھیڑ عمر بیوی نے شرما کر مسکراتے ہوئے، ہم دونوں کی جانب دیکھا اور اپنی سب مصروفیات کو چھوڑ کر گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے شوہر سے پوچھنے لگی کہ یہ کون ہے ۔۔ ؟

"اری، یہ موانگی ہے۔ میرا یار، میرا بھائی، میرا بہت کچھ۔"

مکوزی کا گھر بار، اس کی وفا شعار بیوی، اس کے شگفتہ بچے اور اس کا شادماں ماحول دیکھ کر مجھے یک گونہ تسلی سی ہوگئی۔ میرے ذہن سے ماضی کا وہ مفلس مخبوط الحواس نوجوان مکوزی محو ہو گیا۔ جس نے اپنی زندگی کے المیہ راگ کو عزائم کے کفن میں لپیٹ رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے"۔ اپنے دوست کی آسودہ حالی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ اپنے موجودہ حالات پر نہایت قانع اور مطمئن نظر آتا تھا، ماضی کے مکوزی سے یکسر مختلف "ٹھیک ہے"۔ اطمینان سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میں اس کے ساتھ بیٹھک میں چلا آیا۔ ایک کونے میں میز پر کئی موٹی موٹی کتابیں بکھری پڑی تھیں دوسری طرف کتابوں سے بھرا ہوا ایک بہت بڑا شیلف قرینے سے رکھا ہوا تھا" رومن لا، انٹرنیشنل لا، برٹش لا، لا اینڈ جسٹس ۔۔۔!!! یہ سب کتابیں گویا ضدی بچوں کی طرح میرے اطمینان کا منہ چڑا چڑا کر بے پایاں شور مچانے لگیں۔ میں ہکا بکا سا اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ہنسنے لگا: "میں یہ سب کتابیں پڑھ چکا ہوں، تقریباً حفظ کر چکا ہوں۔" وہ ہنس ہنس کر جیسے رو رہا ہو "کچھ سرمایہ جمع کر چکا ہوں، کچھ اور کر لوں گا۔ اور پھر دو چار سال میں ریٹائر ہو کر انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ بس اب صرف چند ہی دنوں کی بات رہ گئی ہے۔"

کوارٹر کے باہر مکوزی کا ایک بچہ یکایک زور زور سے روتے ہوئے اپنے باپ کے ارمانوں کی نمائندگی کرنے لگا اتنے عرصے سے پیہم یاس کو تھپکتی ہوئی یہ بے بس امید، مستقبل کے عمودی کناروں سے پھسل پھسل کر گرتی ہوئی یہ لرزاں آواز کسی دیوانے کی یہ صدائے بازگشت! بالکل وہی مکوزی!

میں عالم تصور میں دیکھنے لگا کہ مکوزی بستر مرگ پر لیٹا ہوا ہے۔ موت سرہانے کھڑی اسے جھنجوڑ رہی ہے اور وہ نیم بیہوشی کے عالم میں سامنے دیوار پر نگاہ جمائے بھرپور عزم کے ساتھ کہہ رہا ہے "دیکھو اب صرف تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ یہ کسر پوری ہوتے ہی میں فوراً انگلینڈ چلا جاؤں گا" انگلینڈ — لنکنز ان — سیموئیل مکوزی — بار — ایٹ — لا — بار — ایٹ —"

اور پھر مکوزی دم توڑ دیتا ہے۔ حیات جاودانی کسی شرمیلی دلہن کی طرح جھجک جھجک کر اس کی جانب قدم بڑھانے لگتی ہے۔ گویا موت کے بعد اس کی تمناؤں کی تشنگی بجھنے کی گھڑی آخر آ ہی پہنچی۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے مرحوم مکوزی کی روح سچ مچ بیرسٹر بن جاتی ہے اور لنکنز ان کا خوش نما سیاہ گاؤن پہنے خدا کی عدالت میں داخل ہوتی ہے۔

"می لارڈ، میں، مرحوم مکوزی کی روح، ایک ذمہ دار بیرسٹر کی حیثیت

سے اس عدالت عالیہ میں انسانیت کا ایک نہایت اہم دعویٰ داخل کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں " مکوزی کی روح کسی نہایت باوقار وکیل کی مانند پُراعتماد طریق سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے ذرا رک جاتی ہے۔ "یور آنر، انسان کا حکومت الٰہی سے یہ سوال ہے کہ وہ بے بس اور مفلس کیوں ہے، اسے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے موت تک کیوں انتظار کرنا پڑتا ہے!!

مَندا

یونائیٹڈ کلب آف نیروبی کے ممبران کو بیک وقت معمول اور انگلینڈ کے جیسا کھانا بہت مرغوب تھا۔ گارڈن ریسٹوران کے مٹن سموسوں کی مانند، تیس پونڈ سالانہ چندہ ادا کر کے وہ کلب ہال میں بڑے بڑے آدمیوں کی تقریریں سنتے، ہر ہفتہ میں ایک دفعہ ڈنر کھاتے اور ہر شام کو اکٹھے مل بیٹھ کر کلب کے بار کے کافی تواضع چکاتے ہوئے مختلف مسائل پر اپنی اہم رائے پیش کرتے۔

کلب کے قواعد کے مطابق ہر نسل و ملت کا فرد ممبر بن سکتا تھا، مگر وہاں کالے چہروں کی نمائندگی صرف افریقی بیرے ہی کرتے۔ پچھلی غیر معمولی سالانہ میٹنگ میں ایک ایشیائی ممبر نے یورپین صدر سے باضابطہ طور پر پوچھا تھا کہ افریقی لوگ کلب کے ممبر بننا کیوں پسند نہیں کرتے، بہت غور و خوض کے بعد کلب کی ہائی کونسل اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ افریقی ابھی مکمل طور پر متمدن نہیں ہوئے۔ اس لئے سوشل لائف کی اعلیٰ اقدار کی پہچان سے قاصر ہیں۔

جب کوئی نیا ممبر پہلی بار کلب ہال میں قدم رکھتا تو پرانے ممبروں کے قیمتی پہناوے

اور نفیس مغربی آداب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی چال میں تھوڑی جھجک اور آواز میں ہلکی سی لکنت آجاتی، لیکن اُن سے گھل مل جانے کے بعد اُس کی مورت بھی دیگر سب مورتوں میں خوب آراستہ نظر آنے لگتی۔ ڈیر مسز دینی جب اُسے اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ ایک نئے اچار کی خوبیاں گنوا رہی ہوتی تو وہ چپکے چپکے اُس کی کھٹی میٹھی نگاہوں کا مزہ چکھتا رہتا۔ لمبا، ادھیڑ عمر بل اپنے ڈیپارٹمنٹ کی قومی خدمات کا ذکر چھیڑ دیتا تو وہ حیرت و تحسین سے اپنی آنکھیں پھیلا دیتا۔ شہر کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی نارائن جی کے بے کار نوجوان لڑکے کی باتیں سنتے ہوئے اسے یقین دلاتا کہ مستقبل قریب میں سارا ملک اُسے ایک بہت بڑا رہنما تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پھر جیسے سب ممبر اس سے بے حد خوش ہو کر اس کے بہت قریب کھنچ آتے اور اب ان سے اپنا ذاتی رابطہ محسوس کرتے ہوئے وہ ان سب کی طرف اس طرح دیکھتا گویا کہنا چاہتا ہو۔ ”اب تم لوگ بھی میرے متعلق کوئی خوش گوار بات کہو۔“

”اشوتی صاحب آپ کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔“

”اشوتی صاحب، میں نے کینیا ٹائمز میں آپ کا مضمون پڑھا تھا۔ معاشیات پر اس سے اچھا مضمون آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔“

”اشوتی صاحب، آپ کا شیو بہت صاف ہوتا ہے۔ آپ کونسا بلیڈ استعمال کرتے ہیں؟“

تب سب لوگ دیوتاؤں سے منہ موڑ کر ایک خدا کی عبادت شروع کر دیتے ہیں۔ تو مٹی کی مورتیاں خود ہی ایک دوسرے کو پوجنے لگتی ہیں۔

آج بھی حسبِ معمول کلب ہال میں کئی لوگ جمع تھے۔ بائیں کونے میں بار کاونٹر کے قریب جب ہرمز جی تاش کی بازی ہار گیا، تو شرط کے مطابق اس نے اپنے سارے گروپ کو وہسکی کا ایک ایک ڈبل پیش کیا۔

"ارے ہرمز جی" رادھاکرشن ہاتھ میں اخبار لئے کسی دوسرے گروپ سے اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے آیا۔ "یہ دیکھو ہرمز جی" اُس نے ہرمز جی کو اخبار دیتے ہوئے کہا۔ "شام جی ہیرجی کا بھی دیوالہ پٹ گیا"

"دیوالہ پٹ گیا؟" ڈاکٹر انعام نے اطمینان سے وہسکی کے گلاس کو منہ کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا، اور سوچنے لگا کہ شاید آج کل ہی شام جی پر پھر ہارٹ اٹیک ہو، اور وہ اسے فوراً بلا بھیجے۔ "بڑی افسوسناک بات ہے۔" اپنی وہسکی ختم کرکے گلاس خالی پاکر وہ بہت رنجیدہ نظر آنے لگا۔

"شام جی بڑا ہوشیار آدمی ہے" ہرمز جی نے اخبار سے نظریں ہٹا کر کہا۔ "دیوالیہ ہوکر بھی اس نے پندرہ ہزار پونڈ کی بچت کی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"دو تین ماہ ہوئے اس نے یہ رقم اپنے بڑے بیٹے کے نام منتقل کرکے کالونی کے باہر بھیج دی تھی۔" ہرمز جی نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ بھی عنقریب انگلینڈ کے کسی بینک میں بیوی کے نام ایک بھاری اکاونٹ کھول دے گا۔ اس نے نہایت پیار بھری نظروں سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا جو نارائن جی کے بے کار نوجوان بیٹے کے خوب صورت بالوں کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی کہ آج کل وہ ان کے گھر کیوں نہیں آتا؟

"آج کل اتنی ایشیائی فرمیں دیوالیہ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"آپ نہیں جانتے مسٹر گڈلک، ہم تاجروں کی حالت بہت پتلی ہو چکی ہے۔"
رادھا کرشن اچانک کسی پھوڑے کی طرح دب کر بہنے لگا اُس کی فرم کئی ماہ سے برابر خسارہ میں جا رہی تھی "کالونی میں ایسا کاروباری مندا پہلی بار آیا ہے۔ آدمیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں مگر گاہک کا نشان نہیں ملتا۔"

"ہاں آج کل واقعی بہت مندا ہے۔" نارائن جی کا بیٹا گویا ہوا "میرے پتا جی کہہ رہے تھے کہ ہماری فیکٹری سے کم از کم بیس آدمیوں کی چھانٹی ہو گی، تین یورپین ستر ایشین۔ مسٹر گڈلک آپ کا گلاس خالی ہو چکا ہے۔ بوائے!"

"ہمارے پوسٹ آفس میں اگلے ماہ نوے اشخاص کو کام سے چھٹی مل رہی ہے۔" مسٹر ہارڈ اسٹون جی، پی، او کے ایک اعلیٰ افسر تھے "نہ جانے یہ سلمپ (slump) یک بیک کہاں سے آ ٹپکا ہے۔"

"یہ ایک ہمہ گیر سلمپ ہے مسٹر ہارڈ اسٹون" اشونی صاحب کہنے لگے "آج ساری دنیا کے ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے کا سہارا لیے کھڑے ہیں۔ میرے خیال میں انگلینڈ اور امریکہ کے حالیہ ٹریڈ سلمپ سے ہماری اقتصادی حالت پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔" اشونی صاحب کی اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی متکبر، داد طلب آنکھیں ڈیر مسز وینی کی کھٹی میٹھی آنکھوں سے ٹکرا کر بمشکل سنبھل سکیں۔ "آج مسٹر وینی کلب میں کیوں نہیں آئے، مسز وینی؟"

"کل عدالت میں اُن کا ایک ضروری کیس ہے۔ اسی کی تیاری کر رہے ہیں" جیسے مسز وینی کہہ رہی ہو "اُن کی غیر موجودگی سے کیا ہوتا ہے؟ آپ جو موجود ہیں۔"

اشونی صاحب خوش ہو کر کہنے لگے "مگر آپ یقین کیجئے یہ سلمپ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔"

"میں جب اُنیس سو پچاس میں پہلی بار یہاں آیا" شمشیر سنگھ کی عادت تھی کہ اپنی آواز کو بڑے دھیان سے سنتا "تو اس ملک میں کوئی غریب نظر نہیں آتا تھا۔" ایک افریقی بیرا آرڈر کے مطابق برانڈی ملی کافی کا پیالہ لئے شمشیر سنگھ کے آگے آکھڑا ہوا "کوئی غریب نظر نہیں آتا تھا، کوئی بے کار نہیں تھا، بلکہ کام کے لئے آدمی نہیں ملتے تھے، مگر آج کسی معمولی نوکری کے لئے بھی بے چارے بیسیوں امیدوار دوڑتے پھرتے ہیں۔"

"میں کتنی اچھی انگریزی بولتا ہوں" شمشیر سنگھ کا ذہن اس کی پیٹھ ٹھوکنے لگا "کتنی اچھی! سب میرے انگریزی لب ولہجہ سے مرعوب نظر آتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مسٹر سنگھ۔ میرا پورا پچھلا مہینہ صرف دو اسامیوں کے لئے مناسب آدمی چننے میں ضائع ہو گیا۔ درخواستیں پڑھتے پڑھتے آنکھیں تھک گئیں۔ ہر روز بنگلے میں کوئی نہ کوئی کسی کی سفارش کے لئے موجود ہوتا۔ اب آپ ہی بتائیں دو ہزار ماہوار تنخواہ پانے والا آدمی کب تک اپنا قیمتی وقت ان معمولی باتوں پر ضائع کرتا پھرے۔" اسپیکر کی نگاہیں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہنے لگیں "میں دو ہزار ماہوار تنخواہ لیتا ہوں۔ سنا؟" اور پھر وہ بڑے مزے سے اپنا امریکن سگار سلگانے میں مشغول ہو گیا۔

"مگر یہ سرد بازاری اچانک کہاں سے آگئی ہے؟ اس کا سبب کیا ہے؟" رام کرشن اپنا گھاٹا گنتے ہوئے بوکھلا کر اسٹاؤٹ کا سارا گلاس یکدم غٹ غٹ چڑھا گیا۔

"میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہ سلمپ ہمہ گیر ہے، معاشیات کے اصول کے مطابق ـــــ"

اسٹاؤٹ سے رام کرشن کا تجسس مزید ابھر کر اسے بے تاب کرنے لگا اس نے اشونی صاحب کو ٹوکتے ہوئے پوچھا" مگر اس کا اصل سبب کیا ہے ؟"

" اصل سبب ؟ ـــ" نارائن جی کا لڑکا وہسکی کے نشہ میں لہرا کر اٹھ کھڑا ہوا، اور مسٹر ہرمز جی سے پوچھنے لگا" اصل سبب کیا ہوتا ہے، مسز ہرمز جی ؟ مجھے آج اصل سبب کا مطلب ضرور سمجھاؤ"۔

مسز ہرمز جی اُسے اپنے پاس بٹھا کر پیار سے اس کے خوب صورت بال چھونے لگی ـــ

ہرمز جی نے ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا کہ وہ انگلینڈ کا اکاونٹ اپنی بیوی کے نام نہیں کھولے گا۔

" مسٹر رام کرشن ـــ" اس نے کہا ـــ" اس سلمپ کا اصل سبب شاید یہ ہے کہ اب ہمیں پہلے کی طرح ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں رہا"۔

" اب ہمیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہے"۔

" بازار میں مقابلہ بڑھ گیا ہے"۔

" پیسے کم ہو گئے ہیں"۔

" افریقی آگے بڑھنا چاہتے ہیں"۔

" نو پالیٹکس، پلیز !"

" مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مندے کا اصل سبب کیا ہے" رام کرشن اسٹاؤٹ

کا ایک اور آرڈر دینا چاہتا تھا، لیکن اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے انکم ٹیکس ایڈوائزر
کو اپنے گھر ڈنر پر مدعو کر رکھا ہے، اُس کی پانچ سال پہلے کی انکم سے متعلق کوئی
جھگڑا اٹھا ہوا تھا وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مندے
کا اصل سبب کیا ہے؟"

جب کلب کے سب ممبر اپنی اپنی کاریں بیٹھ کر چلے گئے تو افریقی ملازمین
جلدی جلدی باقی ماندہ کام سے فارغ ہو کر سرونٹس کوارٹر میں اکٹھے ہو گئے
ملیسو کی نے سب کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے ایک بوتل نکالی جس میں سب
بیروں نے کلب کے ممبروں کے گلاسوں میں سے بچی کھچی شراب چپکے سے جمع کر لی تھی۔

"لوڈوگو، ہو جاؤ تیار!"

"آج کافی کاک ٹیل جمع ہو گئی ہے۔"

"ہرمز جی کی میم صاحب نے تو آج اپنا آخری پیگ چھوا بھی نہیں!"

"اس کی انگلیاں جب اس لونڈے کے بال چھونے لگتی ہیں تو وہ اپنا پیگ
اکثر بھول جاتی ہے۔"

"سالا بارڈ اسٹون صاب تو ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا۔"

سب بیرے "کاک ٹیل" کو اپنے اپنے گلاس میں انڈیل کر پینے لگے۔

"مٹیلے، گڈلک کی میم صاحب بڑی مزیدار عورت ہے، چکوڑے سے بھی زیادہ
مزے دار!"

"اپنی عورتوں میں یہ بات کیوں نہیں ہوتی رفیقی؟"

"یہ تو سیٹھوں کی بات ہے، ڈوگو، عورت تو ہے ہی بڑی اچھی کیٹو، بے فکری کا جینا

تو بھیڑ کو بھی انوکھا بنا دیتا ہے۔"

"چھوڑو، کیا قصہ لے بیٹھے۔" بوڑھے ملیتھیکا سے نہ رہا گیا۔ "کوئی کام کی بات کرو۔ میسوکی، یہ سلمپ کیا ہوتا ہے؟ صاحب لوگ کہتے ہیں آج کل ہمارے ملک میں بڑا بھاری سلمپ آیا ہوا ہے۔"

"سلمپ؟" نیم خواندہ میسوکی سوچ رہا تھا کہ پہلے اپنا گلاس خالی کر لوں، پھر انہیں سلمپ کا مطلب سمجھاؤں گا۔

"یہ لوگ اپنے دھندوں کی باتیں کرتے ہیں' رفیقی،" ماراگوری کہنے لگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سلمپ کوئی اچھی کیبٹو ہی ہوگی جو شراب کی لاگت پہلے سے دو گنی ہو گئی ہے۔"

"میسوکی، بتاؤ نا، سلمپ کیا ہوتا ہے؟"

میسوکی نے جلدی جلدی اپنا گلاس خالی کیا، لب پونچھے اور خالی گلاس میں اور "کاک ٹیل" انڈیل کر مسکرانے لگا۔

"مضے، سلمپ مندے کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں آج کل بڑا مندا آیا ہوا ہے۔" میسوکی نے اپنا گلاس پھر منہ سے لگا لیا۔

"ہہ ہہ ہا ہہ ـــ مندا آیا ہوا ہے ـــ ہہ ہا ہہ ـــ!" مٹیلے ہنسنے لگا۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ تھوڑی پی کر یاروں میں ہنستے ہوئے اس کی سوجھ بوجھ بہت بڑھ جاتی ہے۔

"بتاؤ ویزانگو، بھلا تمہیں یہ مندا کب سے نظر آرہا ہے؟" گویا اپنا سوال مٹیلے نے اپنے آپ ہی سے پوچھا ہو۔ جواب دینے سے پہلے اس کی خنداں آنکھوں میں اچانک

گھنی اداسی ابھر آئی، جیسے کوئی لاش پھول کر پانی کی تابندہ سطح پر آجائے۔

"ویئر آ نگو، ہمارے بوا نے کہتے ہیں منڈا آج آیا ہے مگر میں تو اسے کئی سال سے ننگا دھڑنگا دیکھ رہا ہوں، ۱۹۳۰ سے بھی پہلے سے، جب میں بچپن میں ایک بنئے کے جھوٹے برتن مانجھتے ہوئے سوچا کرتا تھا کہ میرے ماں باپ مجھے گاؤں میں اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے — !"

جب زندگی مر جاتی ہے!

پو پھٹنے والی تھی کہ ادھیڑ عمر تھامس جبرو گے آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہوا اور بستر سے اُٹھنے سے پہلے اپنی بیس سالہ عادت کے مطابق پھر آنکھیں بند کر کے دعا کرنے لگا: "اے خدا، ہماری آنکھیں ہمیشہ کھلی رہیں تاکہ ہم اپنے آس پاس کی تمام فانی اشیاء میں تیری لازوال برکتوں کا نظارہ کر کے تیرا شکر ادا کر سکیں۔ آمین!"

اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں، آس پاس لیٹے ہوئے بیوی بچوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، اُٹھ کر پہلو کے کمرے میں کھانستی ہوئی معمر ماں کو "جامبو" کہا اور اپنے سرکاری کوارٹر کے باہر نل کے قریب کھڑے ہو کر دانت صاف کرتے ہوئے کوئی مقدس ہم گانے لگا۔

"خدا کے بیٹے نے اپنی قربانی سے پہلے ہمیں خوش آئیند مستقبل کا یقین دلایا تھا
خدا کا بیٹا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔
خدا کا بیٹا ــــــ"

پہلو کے کوارٹر میں نوجوان کوٹینو اپنے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"یہ خدا کا بیٹا نہ سوتا ہے۔ نہ سونے دیتا ہے"۔

کچھ دیر میں جرو گے نہا دھو کر تیار ہو گیا اب تک گھر کے سب افراد جاگ اُٹھے تھے اس کی بیوی رسوئی میں ناشتہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئی، دو بڑے بچے شور مچاتے ہوئے اسکول جانے کی تیاری کرنے لگے اُس کی بوڑھی ماں کی کھانسی تھم گئی۔ اور وہ اپنی ڈیڑھ سالہ پوتی تژایا کو چارپائی پر بٹھائے اُس سے کھیلتے ہنسنے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس بے جان، تاریک گھر کو ابھی ابھی کسی پری نے اپنی جادوئی چھڑی سے چھو لیا ہے جس سے چاروں طرف نور برسنے لگا ہے، ساکت گھر کا وجود خود بخود حرکت میں آگیا ہے۔ اُٹھ کر ہنستے ہوئے زندگی کی آنکھ مچولی میں شریک ہو گیا ہے۔

جرو گے نے اپنی عینک کے شیشے صاف کر کے اسے آنکھوں پر سیٹ کیا اور مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا کہنا چاہتا ہو "آدمی کتنا خوش قسمت ہے! میں کتنا خوش قسمت ہوں!"

انبساط میں سر ہلاتے ہوئے وہ اپنی بیوی کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچن میں چلا آیا۔

"لاؤ مودیا، چائے میں دیکھتا ہوں، تم ٹوسٹ تیار کر لو"

وہ نہایت محبت آمیز نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔

"میں سوچتا ہوں مودیا، اگر تم مودیا نہ ہوتی۔ تو جرو گے ہوتی، اور اب جو جرو گے نہیں ہوتی مودیا ہو۔ تم ہی بتاؤ، ہم دونوں میں فرق ہی کیا ہے؟"

اپنا بایاں پہلو مودیا کے دائیں پہلو سے بالکل جوڑ کر وہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا، گویا یہ کہنے کا متمنی "ہم اپنے بچوں کے ماں باپ ہیں۔ مودیا۔ یہ بچے ہمارے پیار کے ننھے منے گیت ہیں، بائبل کے گیتوں کی طرح، جو بنی نوع انسان کو امن

کی بقا کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔

"مودیا، انسان کبھی نہیں مرتا، کیونکہ اُس کی بوڑھی زندگی اپنے بچوں کی تازہ مسکراہٹوں میں جذب ہو کر از سرِ نو شگفتہ اور نوعمر ہو جاتی ہے۔"

اسی اثناء میں ان کی بیٹی زاپا رونے لگی۔ جرمگے دوڑ کر اپنی بیٹی کے پاس آ گیا اور اسے گلے لگا کر پچکارنے لگا۔ "نہ رو بیٹیا، ہماری بٹیا بڑی اچھی ہے۔ بڑی سُندر ہے بڑی ——"

جرمگے کی بوڑھی ماں مسکرانے لگی۔ "بوڑھے ہو گئے ہو جرمگے، مگر پھر بھی نرے بچے ہو۔ یہ بھلی بھلی باتیں بچوں کو بھرے پیٹ ہی اچھی لگتی ہیں۔" پھر اس نے مودیا کو آواز دی۔ "ابھی زاپا کے لئے دودھ تیار ہوا ہے یا نہیں؟"

دودھ کی بوتل منہ سے لگا کر روتی ہوئی زاپا خود بخود چُپ ہو گئی اور اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے گویا اس کی مطمئن آنکھیں کہنے لگیں۔ "اب بتاؤ، اپّی تم کیا کہہ رہے تھے؟"

جرمگے اپنی بیٹی کے آنسوؤں کو پونچھ کر پیار سے کہنے لگا۔ "ہماری زاپا بڑی اچھی ہے، بڑی سندر ہے، بڑی ——"

زاپا اپنے باپ کی ناک پکڑ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی، مانو کہنا چاہتی ہو "بابا تم نرے بچے ہو ——"

جب دفتر جانے کے لئے جرمگے گھر سے نکلا تو تاباں دن نے ہنستے ہوئے اُس کا استقبال کیا۔ یہ خوبصورت دن اس کا جانا پہچانا دوست تھا۔ معمول کے مطابق جرمگے نے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

باہر زندگی بڑی تازہ دم نظر آرہی تھی، ہشاش بشاش اور پُرامید، سارے دن کے اضمحلال سے بے پرواہ، رواں دواں اور مستعد۔

"آؤ، کھڑے کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو؟ یہاں بھاگ دوڑ کیے بغیر کسی کو پرائز نہیں ملتا۔" جروگے اپنے پرائز کے متعلق سوچنے لگا، چار سو شلنگ ماہوار، سرکاری کوارٹر اور مہربان افسر!

اس کی پچیس سالہ قابلِ اعتماد ملازمت کا یہ پرائز! ہر ماہ پہلی تاریخ کو جب وہ اپنی تنخواہ ادھیڑ عمر مودیا کی ہتھیلی پر رکھتا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں جوانی کا رس گھلنے لگتا۔ اس کی معمر ماں خوشی سے آبدیدہ ہو جاتی اور سوچتی کہ اگر آج جروگے کا باپ زندہ ہوتا تو شادمانی سے اُس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے۔ بیچارے نے ساری زندگی غریبی میں رو رو کر کاٹ دی تھی۔

چار سو پچاس شلنگ! اس تنخواہ سے وہ اپنی ثرائی کے لیئے دودھ خریدتا، اپنے سب بچوں کی صحت اور تعلیم خریدتا۔ اپنا اور کنبے کے افراد کا چین خریدتا اور یہ سب کچھ خرید لینے کے بعد بھی ہر ماہ دو چار پونڈ بچ جاتے زندگی کس قدر محفوظ اور قابلِ قبول تھی!

سڑک پر تیز تیز چلتے ہوئے جروگے کی نگاہیں راہگیروں سے کہنے لگیں "آؤ، میری طرح تمہیں بھی پرائز درکار ہے تو ہنسی خوشی اس بھاگ دوڑ میں شریک ہو جاؤ آؤ نا!"

جروگے اچانک ٹھوکر کھا کر اوندھے مُنہ گرنے سے بچا اور ہانپتے ہوئے اپنی رفتار کو ذرا سست کر لیا۔

جروگے کئی سال سے یہ راستہ ہر روز طے کرتا تھا، یہ فاصلہ، جس کی پیشانی

پرانسان کی انتھک جدوجہد کی دلکش تصاویر کھینچی ہوئی تھیں۔ انسانی نوع کی بہبودی کے لئے اس کی بے لوث خدمات کے تابناک خاکے بنے ہوئے تھے۔ یہ راستہ اور جروگے ایک دوسرے سے بخوبی واقف تھے، قدیم رفیق تھے، اس وقت سے، جب بچپن میں ننگا دھڑنگا جروگے اس خطہ کے عریاں سینہ پر دوڑتے پھرتے اپنے باپ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ آج دھرتی نے بھی اپنے وجود کو شاندار یورپی لباس سے ڈھانپ لیا تھا۔ اور اور جروگے بھی کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔

"یہ سٹی سکویر شہر کے پہلے انگریز سٹی انجینیر کا وہ بت" شہر کے اعلیٰ طرز تعمیر کو دیکھ دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکراتا ہوا سکویر کے آس پاس بیسیوں اونچی اونچی عمارات گویا انسان کے عظیم ارادوں پر غور کرتے ہوئے استعجاب و توصیف سے کھڑی کی کھڑی تھا۔"

میونسپل ہسپتال کی عمارت کے سامنے پہنچ کر جروگے ذرا ٹھہر گیا "یہاں کے خوبصورت باغ کے رنگ برنگے پھول ہر نئے مریض کا پرتپاک استقبال کرتے ہیں، یہاں کے فزیشن اور سرجن صاف صاف ایپرن پہنے ہر دم بیماروں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، یہاں کی نرسوں کا معصوم حسن تڑپتے ہوئے اشخاص کا سارا زہر ہنستے ہنستے چوس لیتا ہے"۔ جروگے ان دنوں کو یاد کرنے لگا جب دو سال پہلے وہ موت اور زندگی کی حدود پر تڑپ رہا تھا اور اُسے یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں ہسپتال کے سب کارکنان کو سینکڑوں دعائیں دیں جنہوں نے اس کی پیاری صدیا کو بیوہ ہونے سے بچا لیا، پھول سے بچوں کا سہارا قائم رکھا، بوڑھی ماں کی لاٹھی نہ ٹوٹنے دی۔ احسان و تشکر سے جروگے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

رومن کیتھولک چرچ کے قریب آکر جروگے نے تعظیم سے اپنا سر جھکا لیا۔

"اس چرچ کا کلس آسمان کی تابندہ نیلاہٹ کی جانب انگلی اٹھائے ایک رہگزر دکھا رہا ہے، اس رہگزر پر ایک بہت بڑا کراس استادہ ہے۔ اس کراس سے یسوع مسیح کے خون کی دھار بہہ رہی ہے، اس دھار سے انسانیت کی مسکراہٹیں سیراب ہوتی رہتی ہیں۔"

"گڈ مارننگ، محترم فادر!"

"گڈ مارننگ، جروگے!" پادری بہت جلدی میں نظر آتا تھا لیکن جروگے کو دیکھ کر رک گیا "کہو مودیا کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہے فادر!"

"پچھلے سنڈے وہ ماس سے غیر حاضر تھی۔ اُسے اپنے ساتھ ضرور لایا کرو بیٹا"

گڈریا اپنی بھیڑوں سے متعلق کس قدر فکر مند رہتا ہے!

اب جروگے نانوں کے ریستوران پر آپہنچا۔ نانو اُس کا لنگوٹیا یار تھا اور اس کا یہ چھوٹا سا ریستوران تھا جروگے کی گمشدہ مفلسی و جوانی کا ایک خنداں نشان! پرانے وقتوں میں جب وہ ایک بار دو ڈیڑھ برس تک بیکار رہا تو یہاں چکولا اُبلے اور چوزے کا گوشت کھانے کے لئے یوں بھاگا چلا آتا گویا یہ اس کی ماں کی چکونی ہو۔

یہاں ہر روز نانو دو سگریٹ سلگا کر ایک اپنے دوست کو پیش کرتا اور ایک اپنی انگلیوں میں دبا لیتا۔ پھر جروگے اُسے زبردستی دو چار نصیحتیں پلاتا اور وہ گردے گھونٹ بھر بھر کر منہ بناتا رہتا۔

"نانو، کل تم پھر شراب پی کر پارک میں بہک رہے تھے؟"

"تو کیا ہوا، رفیقی، بہک ہی تو رہا تھا، خون تو نہیں کر دیا کسی کا ——"

"اب تمہارا وقت عاقبت کو سنوارنے کا ہے، نانو ——"

"دیکھو جرو گے، تم عاقبت کو سنوارتے رہتے ہو اور میں اس کا جی بہلاتا رہتا ہوں۔ صرف بنانے سنوارنے سے ہی تو کام نہیں چلتا!"

نانو کی دکان سے آگے بڑھ کر جرو گے سوچنے لگا کہ میرا یار ذرا کھلنڈرا ہے لیکن ہے دل کا سچا موتی۔ اس نے دل پر کراس کا نشان بنا کر دعا مانگی کہ نانو جیسے سچے موتیوں سے دنیا ہمیشہ جگمگاتی رہے۔

جب دفتر تک پہنچنے میں کوئی سو پچاس گز کا فاصلہ رہ جاتا تو جرو گے کی نگاہیں وہاں ایک لنگڑے فقیر کو ڈھونڈنے لگتیں جو اس وقت ہر روز سڑک کے کنارے ایک آم کے درخت کے نیچے چادر پھیلائے بیٹھا ہوتا۔ ہر روز اسے ایک کنگوترے دے کر جرو گے کی روح کو بڑی تسکین ہوتی اور اس کی دعائیں سن سن کر جرو گے چاہتا کہ چھوٹے بڑے کے جھوٹے فرق کو بالائے طاق رکھ کر وہ اسے سینے سے لگا لے۔

آج بھی جرو گے کی نگاہیں آم کے اس درخت کی جانب اٹھیں لیکن خلافِ توقع فقیر کو وہاں نہ پا کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ درخت کے عین نیچے آ کر جرو گے کو محسوس ہوا کہ اگرچہ فقیر کا وجود وہاں موجود نہیں مگر اس کی روح اس کی جانب دونوں ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہی ہے۔ جرو گے کی روح نے آج کنگوترے کی بجائے وہاں چمکتی ہوئی ایک سموئی رکھ دی۔

ایک روح دوسری روح کو دعائیں دینے لگی۔

"خدا کرے تمہارا نام رہتی دُنیا تک زندہ رہے!"

جبروگے کی رُوح یہ سن کر مسکرا اٹھی۔

"انسان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

"تمہارے بوٹے ہمیشہ لہلہاتے رہیں!"

"خدا نے ہولی بک میں وعدہ کر رکھا ہے کہ سب بوٹے لہلہاتے رہیں گے"

"تمہیں یہ سموئی پچاس سو شلنگ بن کر ملے!"

"یہی ہولی لارڈ کا بھی فرمان ہے۔ خیرات کئی سوگنا بڑھ کر ملتی ہے۔"

دفتر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے جبروگے بہت مسرور نظر آرہا تھا، گیٹ پر آفس بورڈ نے گویا اس سے کہا "شاباش! تم بہت نیک ہو۔ شاباش!"

اپنی پیٹھ پر تھپکی محسوس کر کے جبروگے اپنے ذہن سے کہنے لگا "دراصل ہم سب بہت نیک ہیں، ہر انسان نیکی، پیار اور بے غرضی کا سرچشمہ ہے، اس کی ان ہی خوبیوں کی بدولت زندگی کی خوبصورتی سانس لے رہی ہے۔"

ذرا آگے بڑھ کر اُسے اپنا نیا نوجوان انگریز افسر مسٹر البرٹ نظر آیا۔ اس نے خوشی خوشی بہ آواز بلند کہا "گڈ مارننگ، سر!"

مسٹر البرٹ نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سمجھا کہ شاید جبروگے اس سے مخاطب نہیں، اس لئے وہ کوئی جواب دیئے بغیر آگے ہو لیا۔

"مسٹر البرٹ کتنا اچھا آدمی ہے! اتنا بڑا افسر ہے لیکن غرور چھوا بھی نہیں"

جبروگے کی شادمانی جھوم رہی تھی ــــــ!

دوپہر کو دفتر کے سب لوگ باہم بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ سینئر آفیسرز کی بات چل نکلی۔

"ارے تم اس بد دماغ کمینے کی بات کر رہے ہو؟ میرے بس کی بات ہو تو اُسے گولی سے اڑا دوں"۔

"پیٹی سن کو کون نہیں جانتا' یار۔ ہر دم ماتھے پر تیوری چڑھائے رکھتا ہے۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے' حرامی پلا!"

"آج سویرے البرٹ مجھ پر بلاوجہ گرجنے لگا۔ میں نے بھی خلبیث کو وہ وہ سنائیں کہ تلملا اٹھا"۔

"ارے بھائیو"۔ جرِوگے اُن سب کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت نرم لہجہ میں گویا ہوا" اس طرح اپنے افسروں کی بد خواہی سے تمہیں مل ہی کیا جاتا ہے؟ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے رہتے ہو؟"

سب کلرک آنکھوں سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔

"خوشامدی"!

"غلام"!

"بڑا خطرناک آدمی ہے"۔

جرِوگے کہہ رہا تھا" ہر انسان اپنے اپنے ڈھنگ میں ٹھیک ہوتا ہے۔ اگر وہ بُرا ہوتا تو انسان نہ ہوتا؟"

"ریاکار!" ایک اور نظر نے اس پر بندوق کی گولی چھوڑی۔

جرِوگے نے بڑے چین سے مسکراتے ہوئے ان سب کو دیکھا گویا اُسے

یقین ہو کہ اب وہ اپنے کیئے پر پچھتا رہے ہیں۔

دفتر سے چھٹی ملنے میں پانچ دس منٹ باقی تھے کہ چپراسی نے آکر جرونگے کو اطلاع دی کہ اُسے مسٹر البرٹ نے بلایا ہے۔ جرونگے خوش خوش مسٹر البرٹ کے آفس کے دروازہ پر آیا لیکن اندر چونکہ دو چار کلرک البرٹ سے بات کر رہے تھے۔ اس لئے باہر رک گیا۔

"کم اِن!" مسٹر البرٹ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"یہ دیکھیئے" اس رجسٹر میں پوری نصف درجن انٹریاں غلط ہیں"۔

جرونگے معافی مانگنے کے انداز میں ہتھیلیاں ملتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"پچیس سال کے تجربہ کے باوجود کوئی ایسی واہیات غلطیوں کا مرتکب ہو تو یہ اس کی انتہائی غیر ذمہ داری ہے"۔

جرونگے بدستور مسکراتا رہا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو" مسٹر البرٹ" آپ بہت اچھے ہیں"۔

"میں نے آپ کو مسکراتا دیکھنے کے لئے یہاں نہیں بلایا۔ آپ کو تحریری بیان پیش کرنا ہو گا" جرونگے کی مسکراہٹیں پھیکی پڑنے لگیں اور وہ خفیف سا ہو کر ایک طرف کھڑے جونیر کلرکوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے اور بھی رپورٹیں ملی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کام روز بروز بے حد غیر تسلی بخش ہوتا جا رہا ہے"۔

جرونگے کی مسکراہٹیں یکسر تاریک ہو گئیں اور وہ ہکلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"مگر ـــــ مگر ـــــ"

"مگر دگر سے کچھ نہیں بنے گا۔ کان کھول کر سن لیجئے، مجھے یہاں نکمے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے"۔

"نکما آدمی!" جیسے جرو گے کی بوڑھی ٹھوڑی پر اس نوجوان افسر نے اپنے پالش شدہ چمکیلے جوتے سے ٹھوکر ماری ہو۔

"مجھے یہاں نکمے آدمیوں کی ضرورت نہیں"۔ قریب کھڑے جونیر کلرکوں کی خاموشی قہقہے لگا لگا کر اس کا مذاق اڑانے لگی۔

دفتر سے گھر لوٹتے وقت اس نے ایک کلرک کو کہتے سنا۔ "مسٹر البرٹ دل کا بہت نیک ہے"۔

"نیک ہو!" جرو گے دانت پیسنے لگا۔

راستے میں اس آم کے درخت کے نیچے لنگڑے فقیر کی خالی کوری جگہ بتا رہی تھی کہ وہ آج سارا دن وہاں نہ آیا تھا۔

"شاید — شاید اس کی اچانک موت واقع ہو گئی ہو"۔ یہ سوچ کر چہرے سے افسوس ظاہر کرنے کی بجائے وہ تلخ انداز میں مسکرانے لگا۔

آگے جا کر وہ پہلے موڑ پر رک گیا وہ ہر روز اسی دائیں سڑک سے دفتر آتا جاتا تھا۔ یہ راستہ نانو کی دکان سے گذر کر رومن کیتھولک چرچ اور میونسپل ہسپتال سے ہوتے ہوئے اس کے گھر تک جا پہنچتا۔ جرو گے نے مشکوک نظروں سے اس رہگزر کی جانب دیکھا اور منہ سکیڑ کر خلاف معمول آج دوسری ویران سڑک کی طرف مڑ گیا۔

گھر کے دروازے پر اس کی ادھیڑ عمر، وفا شعار موویا لے اپنی نوجوان، رس بھری مسکراہٹوں سے اس کا استقبال کیا مگر وہ جھنجلا کر سوچنے لگا کہ عورت بوڑھی ہو جائے تو

اُسے جوان بن بن کر اپنی نمائش نہیں کرنی چاہیے۔

ژایا نے اپنے باپ کی طرف پیار بھری معصوم نظروں سے دیکھا اور اپنے کھلونوں کے سے ہاتھ پھیلا دیئے مگر پیشانی پر شکن ڈالے جروگے تیز تیز آگے بڑھ گیا۔

اس کی محبت اور بقا کا یہ ننھا منا گیت رونے لگا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے لڑھکتا ہوا جروگے کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

جروگے نے مڑ کر غضب ناک نظروں سے اپنی ڈیڑھ سالہ ژائی کو گھورا۔ "موت کے سائے کی طرح ہر دم سر پر منڈلاتی رہتی ہے"۔

"جروگے! جروگے بیٹا!"

جروگے کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی آواز کسی مقبرے میں کانپ کانپ کر گونج رہی ہے۔ "جروگے!"

مگر مردے کیا خاک جواب دیں گے؟!

دھرتی کا کال

خدا کے کھلے آسمان کے نیچے لیک صاحب کی دھرتی پر ان کا فرلقی لیبر آگ تاپ رہا تھا۔

مبویا نے اپنے بوڑھے بدن کو بوسیدہ کمبل سے اچھی طرح ڈھانپ لیا اور ٹھٹھری سی آواز میں مینڈا کا سے پوچھنے لگا "بڑھاپے میں آدمی اپنی جوانی کیوں یاد کرتا رہتا ہے؟"

"کیونکہ اسے سردی بڑا تنگ کرتی ہے"

"یہ کمبل مجھ سے بھی بوڑھا ہے" مبویا نے ایک سلگتی ہوئی گیلی لکڑی کو آگ میں جھونک کر کہا۔ "ذرا آرام پہنچانا تو درکنار، الٹا میری ہڈیوں سے رہی سہی گرمی بھی کھینچتا رہتا ہے"

"میرے باپ نے ساری عمر گرم کپڑا دیکھا بھی نہ تھا"

"ارے تو گرم کپڑے کی بات چھوڑ کے دیکھ نا' میرے باپ نے اپنی کھال کے سوا کبھی کچھ پہنا ہی نہ تھا" مبویا نے گچرو کی بات کا جواب دیتے ہوئے بوڑھے

کمبل کو اور زیادہ اپنے ساتھ چمٹا لیا گویا اپنی گرمی واپس چھین لینے کے لئے اس سے نبرد آزما ہو۔" نوّے برس کی عمر میں اُسے بڑا سخت بخار آیا، مرتے مرتے بھی بدن سے گرمی کے پہاڑ پھوٹتے رہے۔ منگا ننگا ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ بھئی یہ تو خود کلمنجارو دادا اپنی آگ برسا رہا ہے میری جھاڑ پھونک بے چاری یہاں کیا کرے گی؟"

سب مزدور گھڑی بھر کے لئے آگ تاپنا بھول گئے۔ ان کی نظریں بے تحاشا دوڑ کر کلمنجارو پہاڑ کی گود میں جا کھڑی ہوئیں، لیک صاحب کے سرسبز کھیتوں کے پار، ورونگو مزوری کے فارم سے آگے، درختوں کے اس دھندلے جھنڈ سے بھی کئی کوس دُور۔ وہاں ان سب کے گھربار تھے، گھاس پھوس کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے، جہاں ان کی بیویاں اکثر اپنا کام کرتی ہوئی رُک جاتیں اور لیک صاحب کے فارم کی طرف منہ لٹکائے جانے کیا سوچتی رہتیں۔ ان اداس سہاگنوں کو دیکھ دیکھ کر کلمنجارو کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ بے اختیار رو دینے کے لئے اپنا پوپلا منہ گھنے بادلوں میں چھپا لیتا۔

"اس سال بھی دادا کلمو کے قدموں پر ہی کام مل جاتا تو مزہ آجاتا۔"

مکھامبا اپنی نئی نویلی دلہن کے متعلق سوچنے لگا۔ اس نے دو بکریوں اور تین بھیڑوں کے عوض اپنی بٹیا سے بڑے چاؤ سے بیاہ رچایا تھا۔ دو بھیڑوں کا قرض ابھی تک باقی تھا۔

"مکھامبا، اگر تو ٹھوسونے سے پہلے پہلے بھیڑیں نہ ملیں" بٹیا کے باپ نے دو ٹوک کہہ رکھا تھا "تو چھوکریا اور ٹو دونوں چھین لوں گا۔"

"ہاں بابا۔"

مکھامبا کا جی چاہتا کہ شتر مرغ کی طرح گردن اکڑا کر پر پھیلائے اپنی مادہ کے سامنے ناچتا رہے، مگر دو بھیڑیں بھاگتی ہوئی اس کی ٹانگوں میں آگھسنیں اور وہ ناچنا بھول کر لاٹھی لئے انھیں پکڑنے کو دوڑتا۔

"میں۔م۔میں!" ان بھیڑوں کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرتے کرتے اب اس کا دم پھول گیا تھا۔

"پٹیا کی یاد ستا رہی ہے مکھا مبا؟"

"بے صبر کیوں ہوتے ہو رفیقی؟ پہلے دو چار شلنگی تو کما لو"

"ٹھیک کہتے ہو گیچڑو۔ ڈرونگو کا شلنگی تو شیمبے سے بھی زیادہ بلوان ہے"

"کبھی ہماری بستی کی ساری زمین کلمو دادا کی تھی، وہاں ہماری چھوٹی چھوٹی کھیتیاں لہرایا کرتی تھیں" ادھیڑ عمر موانزی کا بچپن بڑا بیچ دھیچ کر اس کی کیچڑ بھری آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"دادا تو ہمارا ہے۔ پھر ڈرونگو کے پاس یہ ساری زمین کیسے چلی گئی؟"

"وہ میں تمہیں پورا قصہ سناتا ہوں" بوڑھے مبویا کو آگ کے قریب سرکتے دیکھ کر دوسرے بھی ذرا نزدیک کھنچ آئے "بلوبا، آگ سرد پڑ رہی ہے۔ جاؤ کچھ سوکھی لکڑیاں چن لاؤ"

"جاتا ہوں مضے۔ ذرا یہ بلی کا خون پی لوں پہلے"

"اچھا یہ بات ہے! اسی لئے سب سے الگ بیٹھے ہو"

"لاؤ بلوبا، تھوڑا ادھر بھی لاؤ۔ زیادہ پیو گے تو پیٹ میں جم جائے گا"

"مضے" ڈرورو نے مبویا سے کہا "میں آج کھیت سے کچھ آلو چرا لایا ہوں۔ اس پیڑ کے نیچے رکھے ہیں"

"ہاں ہاں، لاؤ بھون کے کھائیں گے" جب ڈرورو آلو لانے کے لئے اٹھا تو مبویا سب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "چوری کرنا بہت بری بات ہے۔ لیکن اگر چور بننا ہی پڑ جائے تو آلوؤں کی چوری مت کیا کرو۔ چپکے سے کوئی بھیڑ بکری اٹھا لایا

کردو، پاروں میں بیٹھ کر تا بت بھیڑ بھونے ایک عمر گزر گئی ہے۔"

"مجھے تو بھیڑ کے گوشت کا مزہ ہی بھول چکا ہے، مضے۔"

"روتے کیوں ہو، ڈوگو؟ میں لاؤں گا بھیڑ تمہارے لیے۔" گچرو گویا ہوا۔ "پر اپنا بوانا حرامی ایک پل کے لیے بھی کسی بھیڑ کو ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔"

"یہ لو مضے، آلو۔"

"انھیں آگ ہی میں دبا دو۔ اگر سچ پوچھو ویزانگو، تو بھنے ہوئے آلو کا مزہ بھی بھیڑ کا سا ہی ہوتا ہے۔"

"بلکہ آلو بھیڑ سے کچھ اچھا ہی ہوتا ہے، ڈوگو۔"

"اگر وزنگو بیمار پڑ جائے تو وہ آلو ہی کھاتا ہے۔"

"تم نے بتایا نہیں مضے، ہمارے دادا کی طاقت ڈھیلی کیسے پڑ گئی۔"

"آلو کھا کھا کر، جب وزونگو نے ساری بھیڑیں اپنے قبضہ میں کر لیں تو بڈھا دادا آلو کھا کھا کر ہی گزارا کرنے لگا۔"

"تمہاری بات کاٹنے کی عادت بہت بری ہے گچرو۔" مینڈا گچرو کو منہ بہ کر کے پھر مبویا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "مضے! دادا کلمو اتنا طاقت ور تھا، ہر روز پہاڑ کی چوٹی سے اس کے قہقہے گڑگڑ سنائی دیتے تھے، پھر ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے چاچا کلٹینگا چارپائی سے سر لٹکائے لگاتار کھانس کھانس کر لہو تھوکا کرتا تھا، اور اب وہ آوازیں آنا بھی بند ہو گئی ہیں۔"

"کہیں دادا کلمو مر تو نہیں گیا؟"

"نہیں دادا کلمو ہمارا موئنگو ہے۔ جب تک دھرتی پر شو اگلتی رہتی ہے،

آلوؤں کے ڈھیر کود کود کر باہر آتے ہیں۔ اُس وقت تک یہی سمجھنا چاہیئے کہ دادا زندہ ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو ڈونگو، دادا کلمو کبھی نہیں مر سکتا وہ کمزور ضرور پڑ گیا ہے مگر زندہ ہے، شاید اپنے بُرے دن ٹال رہا ہے۔"

"اچھا تو ڈیرانگو، سنو اپنے دادا کی کہانی" بوڑھے مبویا نے بچے کی سی معصومیت کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "بچپن میں میرا بابا یہ کہانی سنایا کرتا تھا۔

"پہلے پہل یہ ساری زمین ہمارے دادا ہی کی تھی اس نے یہ ساری دھرتی ہمارے سپرد کر رکھی تھی، واٹھونیوسی کے سپرد، یہاں واٹھونیوسی نے چھوٹی چھوٹی بستیاں بسا رکھی تھیں، آس پاس بڑے گھنے جنگل تھے اور پہاڑ کی چوٹی پر دادا کلمو اکیلا رہتا تھا۔"

"دادا اکیلا کیوں رہتا تھا، مفیے؟ نیچے اتر کر واٹھونیوسی کے ساتھ کیوں نہ رہتا۔"

"اوپر دادا کو بڑا کام تھا، چوٹی پر بیٹھ کر وہ ہر طرف نظر رکھتا ہماری حفاظت کرتا، آسمان سے کہہ سن کر ہماری کھیتیوں کے لئے مینہ بھیجتا۔ ہمارے پینے کے لئے میٹھے پانی کی ندیاں اُٹھا دیتا پہاڑ کے سینے میں چھپا کر تار ہنتا تا کہ بیماروں کے لئے دادا کے گرم چشمے نیچے بہتے رہیں۔ کوئی دو چار کام ہوں تو گنواؤں بھی۔ خیر آگے سُنو!

"جب وزونگو یہاں پہلی بار آیا تو دادا کی طبیعت بڑی خراب تھی۔ ڈھیر سا کام

اور ہمارے دادا کی اکیلی جان، وہ بیمار ہو کر کئی دن سے سویا پڑا تھا۔ وزونگو نے اپنے لئے یہ موقع بڑا غنیمت سمجھا اور پہاڑ پر کمندیں ڈال کر اوپر چوٹی پر جا پہنچا۔"

"اوپر چوٹی پر دادا کے پاس جا پہنچا؟!"

"ہاں، دادا کی اس متبرک برفانی چوٹی پر ابھی تک کسی واٹھو کے قدموں کا انسان نہ پڑا تھا مگر وزونگو جو سمندر چیر کر ہمارے دیش میں آیا تھا۔ واٹھونیوسی کے دیکھتے ہی دیکھتے دادا کے پاس بھی جا پہنچا۔ اُس نے دادا کی بڑی سیوا کی۔ میرے بابا کر لیک صاحب کے بابا نے بتایا تھا کہ دادا وزونگو سے بڑا خوش ہوا اور اس سے کہا کہ اب یہاں کا سارا دھندا تم ہی سنبھالو اور میرے واٹھونیوسی کے سر پر ہاتھ رکھ دو۔ وہ بڑا بھولا ہے کوئی چھل بل نہیں جانتا۔ میں یہاں کی ساری دھرتی ساری ندیاں، چشمے اور کھیتیاں آج سے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" بھو کے ڈرورو نے آگ میں دبا ہوا ایک آلو نکالا مگر یہ ابھی پوری طرح نہیں بھن پایا تھا۔

"پھر یہی ہوا جو تم سب دیکھ ہی رہے ہو۔ وزونگو جنگل صاف کروانے میں جُٹ گیا۔ ہمارے باپ دادا بھی دادا کا حکم پا کر وزونگو کا ہاتھ بٹانے لگے، اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو چھوڑ کر وزونگو کے بڑے بڑے فارموں میں کام کرنے لگے۔ دادا کلمو نے ساری دھرتی وزونگو کو سونپ دی تھی، اس لئے وہ اسی کا کام کر کے ہی اپنا اپنا کام چلا لیتے۔"

"جیسے ہمارا کام چل رہا ہے۔"

"ہاں، مگر وہ دن اتنے بُرے نہ تھے، کھانے پینے کی سب چیزیں خوب ملتی

تھیں اور وُزونگو مہربان تھا"

"وُزونگو انہیں بھیڑیں بھی دیا کرتا تھا، مفے؟" گیجو کی زبان پر ابھی تک بھیڑ کے گوشت کا ذائقہ تھا۔

"اُن دنوں بھیڑیں تھیں ہی بہت، وزونگو کے فارموں کے باہر بھی بھٹکتے، بلیوں کی طرح گھومتی پھرتیں تھیں"

"مگر اب تو کتے بلیاں بھی نظر نہیں آتے" بیو با نے اپنا من بھاتا بلّی کا خون پھر منہ سے لگا لیا۔

"میں پرانے زمانے کی بات کر رہا ہوں بیلو با، اب تو سارا معاملہ ہی بدل چکا ہے۔ ہمیں اپنے جھونپڑوں کے لئے بھی مالک کو گز گز بھر دھرتی کا کرایہ دینا پڑتا ہے پھر بھی وزونگو کا شکر ہے۔ مزدوری کا شلنگی دے کر ہی سو فی لیتا ہے"

"مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں، مفے، کہ دادا اپنے ہی ہاتھ میں سارا معاملہ رکھنا تو اچھا تھا"

"رکھنا، تب نا؟ وہ کیا کہاوت ہے ہمارے بزرگوں کی؟ اگر کوئی واقعہ ایک بار شروع ہو جائے تو اُسے دوبارہ نئے سرے سے شروع نہیں کیا جا سکتا" ان پڑھ مفے کی آواز میں ارسطو کے علم و وقار کا سا ٹھہراؤ تھا۔

"بعض دفعہ کلمنجارو کی چوٹی پر بڑی ہولناک سیٹیاں بجنے لگتیں۔ انھیں سن کر میرا بابا کہا کرتا، سنو، دادا رو رہا ہے۔ اُس سے ہماری جلے گھڑی دیکھی نہیں جاتی"

"اب تو دادا نے بڑی گہری چپ سادھ رکھی ہے"

"یہ بڑے گھر چھپاوے کی جیب ہے میلنڈ کا۔ ہمارا دُکھ دیکھ دیکھ کر وہ کچھ کر نہیں پاتا۔ وہ دیکھو" منضے مہوبا نے کلنجارو کی برفانی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "سوچتے سوچتے اس کے چہرے کی جھریاں جم کر رہ گئی ہیں" پھر وہ بھنے ہوئے آلو کی خوشبو سونگھ کر کہنے لگا۔ "مرانزی، دو گرم گرم آلو نکالنا میرے لئے۔"

"ایک ایک شلنگی کے لئے ہم کہاں کہاں ٹکریں مار رہے ہیں، بال بچوں کو گھروں میں اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔ رفیقی، ایک آلو میرے لئے بھی۔"

"بے صبر کیوں ہوتے ہو، ڈوگو۔ سب کو ملے گا۔" ڈرورو نے سب یاروں کو اپنے چرائے ہوئے آلوؤں پر للچائی نظریں جمائے دیکھا تو سوچنے لگا کہ وہ ہر روز آلو چرا کر لایا کرے گا۔

"اگر مجھے آدھی مزدوری پر بھی اپنی بستی کے قریب کام مل جاتا تو میں نہیں کہیں ٹک جاتا۔"

"پچھلے سال ہم وہاں تھے، اس سال یہاں ہیں اگلے سال شاید یہاں سے بھی آگے جانا پڑے۔"

"اور اس طرح آگے جاتے جاتے ایک دن ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ جہاں سے دادا کی چوٹی بھی نظر نہ آئے گی۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم، یہ فاصلہ تو اب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ ڈرورو تمہارے آلو بڑے مزے دار ہیں۔"

"دادا کی چوٹی دیکھ کر اب تو پھر بھی لگتا ہے۔ جیسے بیوی بچے پاس ہی ہوں۔ دور جا کر جب دادا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو انھیں من کی آنکھوں سے بھی نہ

دیکھ پائیں گے۔" موانزی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"لو، موانزی، یہ آلو بڑا اچھا بھنا ہے۔" مبوبا کی اپنی بھوک بھی کسی دبے ہوئے آلو کی طرح تپتی رہی۔

"مفضے" موانزی نے جلتے ہوئے آلو کو چبائے بغیر نگل کر کہا۔ "اگر ہم بھی چار چار گز زمین کے مالک ہوتے تو اپنی بستی میں ٹک کر کھیتی باڑی کرتے، بیوی بچوں کے ساتھ رہتے۔" اس کی چھاتی جلنے لگی، نہ جانے سلگتے آلو سے یا اپنی دکھتی خواہشات سے۔

"صرف رونے دھونے سے پرائی چیز اپنی نہیں بن جاتی، موانزی۔" مفضے مبوبا کے بوڑھے چہرے پر جوانوں کا سا استحکام نظر آنے لگا۔ "تم تو کسان کے بیٹے ہو، جانتے نہیں بیج گرمی سردی برداشت کر کے ہی پھلتا پھولتا ہے؟ محنت سے اپنا کام کیے جاؤ۔"

"محنت تو ہم جی توڑ کر کرتے ہیں مفضے۔" گچرو سے نہ رہا گیا۔ "پر کچھ بنے بھی۔ اب دیکھو اتنی سردی میں رات گزارنے کے لئے ایک چھت بھی نصیب نہیں۔ ساری رات کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھرتے رہیں گے۔"

"آگ کے ہوتے ہوئے ہمیں چھت کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"جی بہلانے کو یہ ٹھیک ہے مفضے، مگر اپنی چھت کی بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔"

"ہاں گچرو، تم ٹھیک کہتے ہو، سویرے اٹھتا ہوں تو جوڑ جوڑ پالے سے اکڑا ہوتا ہے۔" بیلوبا نے گچرو کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"کل رات سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پالے سے گھنٹوں نیند نہ آئی، جاڑا

تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے جی میں آئی کہ بال بچوں سمیت وہیں کسی تارے میں جا گھسوں اور وہاں اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں وہیں اپنی کھیتی باڑی کروں۔"

"تو نے میرے دل کی ہی بات بوجھی ہے گجرو۔ اب تو چاند تاروں پر ہی گھر بسانے پڑیں گے۔ یہاں تو ہمارے لئے چپّہ بھر دھرتی نہیں بچی۔"

"یہ چھوٹے چھوٹے چمک دار نقطے خود بے چارے بے گھر ہیں۔"

بوڑھا مبو یا تاروں کی طرف اشارہ کرکے انھیں سمجھانے لگا۔" اور ساری ساری رات ٹھکانوں کے لیے آسمان کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔"

"نہیں مفے، یہ چاند تارے بھی ہماری زمین کی طرح ہی ہیں۔ اس سے بھی بہت بڑے!"

مفے ہنسنے لگا۔" ارے مورکھو، دھرتی کی بھوک نے تمہیں اندھا بنا دیا ہے۔ اب تمہیں آکاش پر بھی دھرتی ہی کا دھوکا ہونا ہے۔ پر اس میں تمہارا کیا دوش؟ بھوکے کو روٹی کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔"

"نہیں مفے، مجھے بیک صاحب کے کرانی نے یہی بتایا تھا۔ وہ کہتا تھا وزونگو اب وہاں پہنچنے کا جتن کر رہا ہے۔"

"ارے وزونگو بے چارہ وہاں کیا پہنچے گا؟ ذرا ہمارے دادا کلمو کی چوٹی دیکھو نا، سب تاروں سے سر نکالے کھڑی ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں مفے۔ اگر وزونگو دادا کے پاس چوٹی تک جا پہنچا تو تاروں تک پہنچنا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟"

"ہم بھی وہاں پہنچ سکیں تو کیا ہی اچھا ہو، اپنے بڈھے دادا کلمو کو قریب سے

دیکھا کریں گے۔ اس سے باتیں کریں گے۔ اُس کی ڈھارس بندھائیں گے، ہمیں خوش پا کر وہ بھی خوش ہو اٹھے گا۔"

"ہاں مینڈ کا، ہمارے دکھ سے دادا اپنے جی کو بڑا بھاری کیے بیٹھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کلنجیارو کی سب پہاڑیاں پھر اس کے قہقہوں سے گونج اُٹھیں۔"

"ارے دیکھو مٹھے، وہ کون آرہا ہے؟"

"اپنا کراؤ کی ہے۔ کئی بار کہا ہے اس سے کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آیا کرو، مگر کام سے فارغ ہو کر ——— کیا نام ہے اس کراؤکی کا؟ اپنا ہی واٹھو نیوسی ہے — اُس کے پاس جا بیٹھتا ہے اور سارا کا رٹیسی پڑھ کر ہی آتا ہے۔"

"بڑا ہوشیار ہے اپنا کراؤ کی، مٹھے۔ دیکھ لینا ایک دن لیبر سے نکل کر کرانی بن جائے گا۔"

"جامبو، کراؤ کی!" جب کراؤ کی قریب آیا تو بلوبا نے کہا۔

"جامبو، بلوبا، جامبو، واٹھو اوٹھے!"

"جامبو!"

"آؤ بھنے ہوئے آلو کھاؤ۔ بہت مزے دار ہیں۔"

"سانٹے، سفیہ۔" کراؤ کی ایک آلو لے کر الاؤ کے قریب ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔

"تم سے کئی بار کہا ہے کراؤ کی، اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے آ جایا کرو زمانہ بہت بُرا ہے بیٹا، اور اندھیرے میں کیڑے مکوڑے کا بھی ڈر رہتا ہے۔"

"آج کرانی سے بات ہی کچھ ایسی چل نکلی تھی، کئی بار اٹھا پھر بیٹھ گیا۔"

"جب ہم بستی سے چلے تھے ٹوٹو، تو تمہاری ماں نے بار بار کہا تھا، میرے

کرادکی کا خیال رکھنا مضے۔ ایک بیٹے کی ماں اندھی ہوتی ہے۔"

"کل سے ضرور وقت پر لوٹ آیا کروں گا مضے۔"

"کرادکی، آج کرانی سے کیا بات چل نکلی تھی؟" یلوبا نے پوچھا۔

"وہ تارا دیکھو، وہ دادا کی چوٹی کے پاس ۔ اسے وزونگو تارا کہتے ہیں۔ وہ ہماری ساری دھرتی سے بھی بہت بڑا ہے۔"

"سُن لو مضے، میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔ مجھے لیک صاحب کے کرانی ۔۔"

"ارے بات تو پوری ہو لینے دو۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وزونگو وہاں جلد ہی پہنچنے والا ہے۔ وہاں ساری زمین خالی پڑی ہے۔ جب وزونگو وہاں پہنچ جائے گا تو ایک دو شلنگی میں ہی ہمیں ڈھیر زمین مل جائے گی۔"

"واہ ڈوگو، واہ! بس ایک دو شلنگی میں ہی!"

"بھئی مزہ آگیا تمہاری جباری سن کر، کیوں مبنڈ گا، میں نہ کہتا تھا ہمارا کرادکی ضرور کرانی بنے گا؟"

"ہاں رفیقی، اپنے قبیلے میں کوئی پڑھا لکھا ہو تو فائدہ ہی ہے۔"

"اب تو ہم سب اپنی اپنی زمین خرید سکیں گے۔"

"وزونگو وہاں جلد ہی پہنچ جائے گا۔" کرادکی کے لہجے میں احمقانہ دانائی تھی۔ "کارٹیسی میں لکھا ہے کہ وہاں ساری زمین خالی پڑی ہے اور جو چاہے خرید سکتا ہے۔"

"ایک دو شلنگی کی بات ہی کیا ہے ڈوگو اب ہماری اپنی زمین ہو گی، اپنے کھیت ہوں گے، اپنے جھونپڑے ہوں گے۔"

"وہ جھیڑوں کا قرض اتر گیا تو میں اپنی بٹیا کو بھی وہیں لے جاؤں گا" کھاسیا اپنی بڈھیا کے ساتھ تاروں کے دلیش میں اڑنے لگا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" جیسے سب سوچ رہے ہوں کہ یہ سچ ہونا ہی چاہیئے۔ "ساری زمین خالی پڑی ہے؟"

سب کی نظریں کنچنجارو پہاڑ کی چوٹی کے پاس اُس درخشندہ تارے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ خیال ہی خیال میں اپنے اپنے بال بچوں سمیت اُس تارے پر جا بسے تھے اور وہاں سے جھانک کر دادا کلمو سے ہم کلام تھے۔

انھیں ہنسنا پا کر دادا کلمو کے چہرے کی برفانی جھریاں پگھلنے لگیں اور پھر گویا دادا کے بھرے بھرے قہقہوں کی گونج سے چاند پہاڑیوں کا سلسلہ شادماں ہو کر اچھلنے کودنے کو بے قرار نظر آنے لگا۔

مگر یکایک منے سبو یا ارسطو کی سی ذہانت سے سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا "ویزا انگو۔ یہ دیکھو، تمہارے سامنے یہ ساری زمین بھی خالی پڑی ہے۔ دُور دُور تک خالی ہے۔ بھلا بتاؤ اس کا ایک چپہ بھی تمہارا ہے؟"

"نہیں، یہ ساری زمین تو لیک صاحب کی ہے۔"

"تو کیا لیک صاحب کے ہاتھ اُس تارے تک نہیں پہنچ سکتے ہیں؟!"

جامبو ریفیقی

اس دلیش کی کہانی ریلوے سے شروع ہوتی ہے۔ ریلوے کی آمد پر تاریک براعظم کا یہ خطہ گویا کسی نوزائیدہ بچے کی طرح روشنی کے اجنبی لمس سے رو پڑا۔ مگر نوزائیدہ بچے کا رونا تو اس کی زندگی کی علامت ہے اس لئے ریلوے کے کارکنان چوکنا ہونے کی بجائے اپنے پیارے بچے پر سر جھکائے اس کے چہرے کے خطوط کا مطالعہ کرنے لگے۔ بچہ ان کی محبت آمیز آنکھوں کی جانب دیکھتے ہوئے روتے روتے چپ ہو گیا، مسکرانے لگا، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ریلوے انجینیر کے قریب کھڑے انگریز پادری نے لیسوع مسیح کو یاد کرتے ہوئے اپنے سینے پر متبرک کراس کا نشان بنایا اور بچے کو بیٹا پکار کر کے ریلوے انجینیر کی پیٹھ پر تھپکی دی "خدا کا بیٹا اپنی تمام برکتیں اس خوبصورت بچے پر نازل کرے۔ آمین!"

"کینیا!" بچے کی تابناک پیشانی چوم کر انگریز ریلوے انجینیر اپنی نوکیلی، بھوری مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اٹھا تاکہ سکاٹ لینڈ کی صدی بھر پرانی وسکی کی بڑی بڑی

بوتلوں کا منہ کھول دے۔

"کینیا!" اس نے وسکی کے گلاس والے ہاتھ کو آگے بڑھا کر نہایت شادماں آواز میں کہا۔

"کینیا!" جواباً بیسیوں ہاتھ سکاچ وسکی کے پیمانوں کو اٹھائے ہوا میں اچھلے اور یہ مبارک گھڑی گویا فرطِ مسرت سے بے قابو ہو کر کسی تند دھن پر دیوانہ وار ناچنے لگی۔

اپنے آقاؤں سے تھوڑے فاصلہ پر ہی ہندوستانی قلی ریلوے لائن کے پہلو میں جگہ جگہ آگ جلائے پانچ پانچ سات سات کے گروپ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے اپنے آقاؤں کی طرح اس مبارک تقریب کو منا رہے تھے۔ تاڑی پی رہے تھے، بیڑیاں پھونک رہے تھے، ہنس کھیل رہے تھے یا شاید بظاہر ہنستے کھیلتے ہزاروں میل دور بیٹھے اپنے بچوں اور بیویوں کے اداس چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے دیکھتے یوکھلا کر وہ مزید تاڑی چڑھانے لگتے یا بیڑیوں کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے سوچنے لگتے کہ واپس بمبئی پہنچ کر وہ رام بائی کے لئے کیسی گرگابی لیں گے، جیتو کا دوپٹہ ذرا گہرا سرخ ہو تو وہ بہت خوش ہوگی، بشیرے کو انگریزی ٹوپی کتنی بھلی معلوم ہوگی!

"بشیرے؟"

"ابا!"

باپ بیٹے نے بے اختیار ایک دوسرے کو بھینچ لیا۔ بے انتہا مسرت آنسوؤں کے دھارے بن بن کر اُن کی آنکھوں سے پھوٹ پڑی، دھڑکتے

دلوں پر پھوار پڑنے لگی۔

"کیوں بھائی شپھیک، کس کی یاد ستا رہی ہے؟" لعل سنگھ بھی اپنے خیالوں میں جیتو کا سرخ دوپٹہ اس کے منہ سے ہٹا رہا تھا۔ "بھائی اپنی جیتو تو ہمیں گھڑی بھر کے لئے بھی نہیں بھولتی۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اُسے چھوڑ آیا تھا۔"

لعل سنگھ ٹھنڈا سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا جہاں مُسکرا مُسکرا کر ٹمٹماتے ہوئے تاروں کا نظارہ کر کے وہ سوچنے لگا کہ سندر چیزیں آدمی سے اتنی دور کیوں ہوتی ہیں۔ پھر جیسے اُسے سب سے درخشندہ تارے میں اپنی جیتو نظر آنے لگی، وہی سلمے والا گہرا سرخ دوپٹہ اوڑھے ہوئے۔

"نی جیتو، اوئے گل تے سُن"

"چل ہٹ پرے"

"ہہ ہہ ہا ہہ ——"

ہنستے ہنستے یکایک جانا پہچانا شور سن کر لعل سنگھ چونک پڑا۔ "آج پھر؟ سنبھل جاؤ شپھیک بھائی۔ کالے لوگ کسی شیر کا پیچھا کرتے ہوئے اِدھر ہی آرہے ہیں۔" پھر لعل سنگھ ہندوستانی کیمپ کی طرف مُنہ کر کے اپنے پورے زور سے چلایا۔ "خبردار! شیر! شش ——" اس سے پہلے کہ وہ پورا لفظ ادا کر سکتا عقب کی جھاڑی سے کوئی وزنی شے نہایت تندی سے اُس پر آگری، پھر ایک اور برق رفتار بلا نے شفیق کو بھی اپنی آہنی دبوچ میں لے لیا۔ دونوں شیر گرج گرج کر آسمان میں شگاف پیدا کرنے لگے۔ چاروں طرف بھاگڑ مچ گئی۔ ابھی

اثنا میں افریقن لوگوں کا ایک گروہ بے انتہا شور مچاتے ہوئے ایک سمت سے نمودار ہوا اور بھالوں سے شیروں پر ٹوٹ پڑا۔ تیز نوکیلے بھالوں کی پے در پے چوٹوں سے دونوں شیر لمحوں ہی میں تڑپ تڑپ کر گرجتے ہوئے دم توڑنے لگے اپنی فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے افریقیوں نے اپنے بھالوں کو شیروں کے اجسام سے پار کر کے انہیں زمین میں دھنسا لیا۔ جب شیر بالکل ساکت ہو گئے تو افریقن مسرت سے دیوانہ وار چلاتے ہوئے ان کے اردگرد تیز تیز ناچنے لگے اپنی آخری گھڑیاں گنتا ہوا لعل سنگھ ایک نہایت درخشندہ تارے کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں اس کی جیتو سرخ دوپٹہ اوڑھے اُسے اشارے کر کر کے اپنے پاس بُلا رہی تھی۔ شفیق بھی اپنے رہے سہے دو چار اٹکے ہوئے سانسوں میں روتے کراہتے اپنے بشیرے کا منہ چوم رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں شور و غل سُن کر دو چار انگریز بھی اپنی اپنی دو نالی بندوق سنبھالے آ پہنچے۔ افریقیوں نے انہیں سرسری نظر سے دیکھا اور بدستور ناچتے رہے ہندوستانی قلی جو شفیق اور لعل سنگھ کو ریڈ کراس کیمپ میں لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ زخمیوں کو چھوڑ کر بوکھلائی ہوئی تعظیم سے ایک طرف کھڑے ہو گئے

"بیوٹی فل!" ایک انگریز نے شیروں کے اردگرد تندی سے ناچتے ہوئے جنگلیوں کے نظارے سے محظوظ ہو کر کہا۔

دوسرا انگریز سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ان شیروں کی کھال لڑکی کو انگلینڈ میں بھیج دے تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ تیسرا اپنے ساتھی کے ذہن کو پڑھتے ہوئے کہنے لگا "اگر کوئی ان جنگلیوں کے شکار کو چھو بھی لے تو یہ کم بخت اُس کی جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔

اب یہ سارا قبیلہ ان شیروں کا تھوڑا تھوڑا کچا گوشت کھائے گا اور کھالیں اُن بہادروں کو ملیں گی جنہوں نے انہیں مارنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔"

"ارے! یہ دو انڈین قلی زخمی پڑے ہیں۔"

"بے چارے!"

ہندوستانی قلیوں کی بے زبانی گویا ہکلا ہکلا کر اپنے آقاؤں سے فریاد کرنے لگی "ساب جی، یہ بڑے گریب آدمی ہیں۔ کسی طرح انہیں بچالیں ساب جی!"

"انہیں فوراً ریڈ کراس کیمپ میں پہنچا دو۔"

اپنے سفید آقا کا حکم پاتے ہی ہندوستانی قلی پھر سرعت سے اپنے زخمی ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کوئی بات نہیں، اگر یہ دونوں مر بھی گئے تو ان کے گھر والوں کو دس دس روپے ماہوار پنشن ملے گی۔"

پھر وہ انگریز اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "کتنے بے زبان ہوتے ہیں یہ ہندوستانی نوکر، وفادار اور بے زبان!"

"ہاں، بالکل میرے پالتو کتے کی طرح۔ مگر دراصل ان لوگوں کی وفاشعاری خود ہمارے سسٹم ہی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ جب کسی جاندار کی اولین ضروریات کا انحصار کسی مخصوص سسٹم کی پابندی پر ہو تو وہ شروع شروع میں بے شک چون وچرا کرے لیکن بعد میں عادتاً وفادار بن جاتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہمارا سسٹم اس ملک میں بھی بخوبی کام کرنے لگے گا تو ہمارا افریقن دوست بھی اپنی وحشیانہ فطرت بھول کر

خود بخود وفادار ہو جائے گا۔"

"ہہ ہہ ہا۔" ہنستے ہوئے ایک انگریز کا چہرہ ایک ناچتے ہوئے افریقی کے بھالے کی نوک سے بال بال بچا اور وہ افریقی گھبراتے کی بجائے بڑی بے باکی سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"جنگلی!" وہ انگریز بے حد غصہ میں اپنی دونالی بندوق کو تھام کر اُس افریقی پر جھپٹنے ہی کو تھا کہ اس کے ساتھی نے اُسے تیزی سے روک لیا۔

"بے وقوف نہ بنو البرٹ۔ تمہاری معمولی سی چوک سے بھی گھڑی بھر میں فساد کھڑا ہو جائے گا اور خون خرابے کے بعد یہ لوگ کام کاج چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔"

البرٹ دانت پیسنے لگا۔

"رونی ٹھیک کہتا ہے البرٹ۔ اس دشوار مہم میں ہمیں ان لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ ابھی ہمیں ریلوے لائن کو سینکڑوں میل آگے لے جانا ہے۔"

البرٹ نے بدستور دانت پیستے ہوئے اپنی دونالی بندوق کو نشانہ باندھنے کے انداز میں سامنے فضا کی طرف کھڑا کر لیا گویا اس کے کان اپنی بندوق کی دھائیں سننے کو بے تاب ہوں۔

چپ چاپ مردہ ہندوستانی قلی دلوں پر آنسو گراتے ہوئے رام سنگھ اور شفیق کے خون کے دھبوں کو گھورتے رہے۔

اچھلنے کودنے افریقی تصورات کے تند بہاؤ میں شیر کے گوشت کا مزہ چکھتے ہوئے بے اختیار چلاتے رہے۔

البرٹ دانت پیستا رہا۔

"کینیا!" تھوڑے فاصلہ پر ہوا میں ہلتے ہوئے یورپین خیمے، لڑکھڑاتے ہوئے مدہوش، مسرور شرابیوں کی طرح چیخ رہے تھے "کینیا!!"

جب ریلوے لائن ممباسہ سے دوئی کے گھنے جنگلات تک آپہنچی تو ہیڈ کوارٹر سے آرڈر آیا کہ نیروبی تک لائن کا کام مزید سرعت سے ختم کیا جائے۔ ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتا ہوا اونچا نیچا راستہ، دشوار گزار جنگلات میں آزادانہ گھومتے پھرنے خونخوار جانوروں کا ہجوم اور کئی وحشی قبائل کے ناگہانی حملوں کا اندیشہ، مگر آرڈر کے مطابق کام کا سرعت سے انجام ہونا ضروری تھا اور اسے پورا کرنے کے لیے ہندوستانی قلیوں کی مدد کے لئے اور زیادہ افریقی لیبر کی خدمات ناگزیر تھیں۔ اس لئے آفیسر انچارج نے حکم دیا کہ آس پاس کے قبائل کے متعدد اشخاص کو کسی طرح کام پر رضا مند کیا جائے۔ ریلوے کے ذمہ دار افریقی اسٹاف کو اِدھر اُدھر جنگلی قبائل کی رہائش گاہوں میں بھیجا گیا تاکہ وہ انگریز بہادر کی جانب سے قبائل کے سرداروں کو ٹیٹھے بن' انگریزی لباس اور شکاری چاقو پیش کریں اور اُن سے درخواست کریں کہ ریلوے لائن کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے صاحب بہادر اُن کے دِلی تعاون کے خواہاں ہیں۔

قبائل کے سرداروں نے صاحب بہادر کے افریقی نمائندوں کے اعزاز میں اپنے طور پر نہایت شاندار ضیافت کی۔ صاحب بہادر کے ارسالی کردہ کپڑوں میں ملبوس ہو کر سرداروں نے ٹیٹھے بن کھائے اور افریقی نمائندوں

نے سرداروں کا تیار کردہ پلی ہوئی بھیڑوں کا بُھنا ہوا گوشت جب میٹھے میٹھے بن کھا کر جنگلی سرداروں کا پیٹ نہ بھرا تو وہ آگ پر رکھی ہوئی بھیڑوں کی ٹانگیں اُٹھا کر اُن سے چپکا ہوا کچا پکا گوشت چوسنے چبانے لگے۔

"وزونگو کا چکولا ہے تو مزیدار" ایک سردار نے ایک ریلوے ملازم کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھنے میں بھی اتنا پھولا ہوا نظر آتا ہے، پر رفیقی، سچ پوچھو تو اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔ تمہارے وزونگو کا ــــــ کیا نام بتلایا تھا؟ ہاں ــــ کوٹ پہن کر بھی یونہی معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے باندھ کر رکھ دیا ہو۔ وزونگو سے کہنا کہ غصہ نہ منائے پر یہ سب چیزیں بور ہیں۔ ڈھیلی ڈھالی نرم کھالیں پہننے یا ننگا رہنے میں بڑا مزہ ہے۔ اگلی بار یہ چیزیں نہ لانا رفیقی، ہاں البتہ وزونگو کے چاقو بڑے عمدہ ہیں۔ اُس سے کہنا ایسے چاقو بے شک سو دو سو اور بھیج دے۔"

سردار نے لکڑی کے ایک بہت بڑے جلتے ہوئے ٹکڑے پر رکھی ہوئی سالم بھیڑ کو صاحب بہادر کے تیز شکاری چاقو سے دو حصوں میں پھاڑ دیا اور پھر نہایت خوش ہو کر بھاری بھاری قہقہے لگانے لگا۔ "یہ چاقو بڑے کام کی چیز ہے پکڑنے میں کتنا آرام دہ اور پھاڑنے میں کتنا تیز۔ ہاں رفیقی، اگلی بار ایسے ہی سو پچاس چاقو ضرور لانا۔ ہہ ہہ ہاہا ــــ!"

"سردار، اگر تم اپنے جوانوں کو ریلوے لائن پر کام کرنے کے لئے بھیج دیا کرو تو وزونگو ان میں روپوں کا ڈھیر تقسیم کیا کرے گا۔"

"ہہ ہہ۔ ہاہا ــــ روپے؟ ہم پیلی چٹی دھاتوں کے ان گول مول ٹکڑوں سے کیا کریں گے، رفیقی؟ یہاں ہمارے علاقے میں ادھر اُدھر سینکڑوں دھاتیں

بکھری پڑی ہیں۔ وزونگو سے کہنا وہ جتنی اور جیسی دھاتیں چاہے یہاں آ کر لے جائے۔ میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ تم آج کل کے کالے جوانوں کے بھیجے بگڑ گئے ہیں جو ان واہیات ٹکڑوں کے لئے سارا دن جان ہلکان کرتے رہتے ہو۔ جاؤ اپنے نیوپے موشو سے کہو کہ میرے سب جوان کل تڑکے ہی اُس کی مدد کے لئے پہنچ جائیں گے، پر رفیقی، ہمیں روپے پیسے نہیں چاہئیں، ہاں اگر تمہارا وزونگو ہمیں سو پچاس چاقو یا پٹشو بھیج سکے تو ٹھیک ہے، اور اگر یہ بھی نہ بھیجے تو بھی ٹھیک ہے۔ وزونگو ہمارا مہمان ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی مدد کریں۔"

"تم بہت اچھے ہو بابا" صاحب بہادر کا کالا نمائندہ کہنے لگا، "اور ہمارا وزونگو بھی تمہاری طرح بہت ہی اچھا ہے۔ ذرا ریلوے لائن نیروبی تک پہنچ لینے دو پھر دیکھنا ہمارے کالے لوگوں کی زندگی کتنی سدھر جاتی ہے۔ ریل گاڑیاں ہمارے لئے ممباسہ اور نیروبی سے نئی نئی چیزیں لایا کریں گی۔ اُن چیزوں کو بیچنے کے لئے جگہ جگہ دکانیں کھل جائیں گی۔ ہمارے یہ بھیانک جنگل خوبصورت بستیوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ پھر ہم سب لوگ بڑے ٹھاٹھ سے ان بستیوں میں رہیں گے۔ اور دکانداروں کو روپے دے کر جو چاہیں گے خریدیں گے اور بابا، یہ روپے ہمیں وزونگو دے گا۔ ہم وزونگو کے لئے کام کریں گے، وزونگو ہمیں روپے دے گا۔ روپوں پیسوں کو محض پیلی چٹی دھاتیں نہ سمجھو بابا، ان پر وزونگو کا ٹھپا لگا ہوتا ہے اور انہیں دے کر ہم جو کچھ بھی چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔"

صاحب بہادر کا ارسال کردہ کوٹ جسے کالے سردار نے اپنے ننگے منقش

بازن پر پہن رکھا تھا" ذرا کسا ہوا تھا۔ اس لئے اپنے تنے ہوئے مضبوط، چوڑے سینے کو کچھ اس طرح پھیلایا کہ تنگ کوٹ کی دونوں بغلوں کی سلائی ادھڑ گئی۔

"ہہ ہہ ہا ۔۔ ہہ" سردار نے سامنے والے بٹن کو کھینچ کر کہا "تمہارا ۔۔۔ کیا کہتے ہوا ہے؟ ۔۔۔ کوٹ دزونگو کے پتلے، سفید بدن پر ہی اچھا ہے رفیقی" اس نے کوٹ کو کھینچ کھینچ کر اتارا اور اسے پرے پھینک دیا۔ پھر اپنے لنگوٹ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "ہمارے لئے سیمبے کی یہ کھال ہی بھلی ہے" پھر اس نے سامنے آگ سے بھیڑ کی ایک اور لمبی سی ہڈی اٹھا کر اس سے چپکے ہوئے گوشت والے حصے کو اپنے مضبوط جبڑے پر رکھ لیا "ذرا میرے جسم پر بنائے ہوئے یہ بیل بوٹے دیکھو میری دانا دادا کیسے انہیں چاٹتے ہوئے باؤلی ہو جاتی ہے، اب تم ہی بتاؤ دانا دا کیسے کو ہم پر پیار آئے تو کیا تمہارے دزونگو کا یہ کوٹ اس کے منہ میں ٹھونس دیں؟ ہہ ہہ ہا۔ ہہ ۔۔۔ تم آج کل کے کالے چھوکرے تو پگلے ہو گئے ہو رفیقی ساب مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔ بتاؤ اس وقت میں دزونگو کے روپے کھاؤں یا بھیڑ کا یہ چیٹ پٹا گوشت۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ دزونگو ہمارا مہمان ہے، میں اس کی مدد کے لئے اپنے جوان کل سویرے ضرور بھیج دوں گا۔"

"اچھا بابا، جامبو۔"

"ہہ ہہ۔ ہا۔ جامبو۔ اور ہاں، رفیقی، دزونگو سے کہنا گاڑی کی ایک لائن ماجھی مزدوری تک بھی بنا دے۔ بڑا میٹھا پانی ہے ماجھی مزدوری کا، پر بہت دور ہے، ہہ ہہ۔ ہا۔ اچھا جامبو۔"

دو چار روز میں ریلوے لائن کسی کھلنڈرے بچے کی طرح چھلانگ مار کر فطرت کی گود سے نیچے آکھڑی ہوئی۔ اور فطرت کی انگلی پکڑے توصیف آمیز تحیّر سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ مُسکرا مسکرا کر اُسے خوش آمدید کہتے ہوئے تناور درختوں کے جُھنڈ، دھرتی کے گداز سینے پر ناچتی ہوئی یہ ننھی منی گھاٹیاں، ان گھاٹیوں پر پائل کی سی جھنکاریں پیدا کرتی ہوئی یہ آبشاریں، مترنم آبشاروں پر کان دھرے ہوئے یہ رنگ برنگے جنگلی پھول جو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے چارسُو خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ ریلوے لائن فطرت کی انگلی تھامے شوق و بے صبری سے رواں دواں آگے بڑھتی گئی۔

فطرت نے بڑے پیار سے کہا۔ "وہ دیکھو میرے حسین میدانوں کی دلآویز وسعتوں کی پیمائش کرتے ہوئے ہرن، بیچاری ننھی منی جانیں چیتوں اور شیروں سے قطعاً غافل ہو کر مزے سے اُچھل کود رہی ہیں۔ کبھی زرّافے دیکھے تھے تم نے؟ وہ دیکھو ایک زرّافہ کس شان سے اپنی اتنی لمبی گردن کو اٹھائے ہوئے ہے۔ درختوں کی چوٹیوں پر چیتے اپنی مکمل حفاظت کے خیال سے ٹانگیں پھیلا کر آرام سے سوئے پڑے ہیں مگر یہ زرّافہ ان خوابیدہ چیتوں کو سونگھتے ہوئے چپکے سے ہڑپ کر جائے گا۔ چلو یہ بھی اچھا ہے کہ سوتے سوتے ہی ان کی جان نکل جائے گی ورنہ اگر یہ بیدار بھی ہوتے تو خود کو اس قدر لمبے زرّافہ کی گرسنہ نگاہوں سے کیونکر بچا سکتے تھے؟"

ریلوے لائن فطرت کی باتوں کو بڑے انہماک سے سنتے ہوئے تیز تیز آگے بڑھ رہی تھی۔

"ارے ۔۔۔ رہ! رک جاؤ" فطرت ریلوے لائن کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ٹھہر گئی "وہ ہاتھیوں کا غول نظر آرہا ہے نا؟ انہیں ذرا نگاہوں سے اوجھل ہو لینے دو۔ بڑے ظالم ہیں یہ کم بخت۔ اگر انہوں نے تمہاری ذرا بھی بھنک پالی تو غصے میں چنگھاڑنا شروع کردیں گے اور تمہیں زمین سے اچھال کر تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیں گے ۔۔۔"

"شاباش! اب کوئی خطرہ نہیں، بڑھاؤ قدم، لیکن ذرا سنبھل سنبھل کر، آگے راستہ بڑی پیچیدہ بلندیوں پر ہے۔ کیوں؟ تھک گئی؟ ارے تم تو لوہے کی بنی ہوئی ہو۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ آؤ، میں تمہیں اپنے کندھوں پر بٹھا لیتی ہوں۔"

فطرت کے کندھوں پر بیٹھے ریلوے لائن نیروبی کی سمت بڑھتی ہوئی چڑھائی کی مسافت طے کرنے لگی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک دلخراش چیخ سن کر فطرت چوکنا ہو کر رک گئی۔ کسی افریقی کو ایک چیتے نے اپنے تیز و تند پنجوں میں جکڑ لیا تھا اور اس کے دانت افریقی کے دل میں گہرا چھید کرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔

"آہ ۔۔۔ ہائے!" دم بھر پہلے جھوم جھوم کر گاتے ہوئے افریقی کی روح چیخ چیخ کر گھنے جنگلات کی جانب بھاگ گئی۔

ڈھائیں ۔۔۔ دھا! کسی انگریز افسر کی بندوق کے دو فائروں نے خون چاٹتے ہوئے ٹائیگر کو بھی وہیں ٹھنڈا کر دیا۔

انگریز افسر نے ٹائیگر اور افریقی کی لاشوں کے پہلو میں کھڑے ہو کر فوٹو اتروایا۔ یہ فوٹو اخباروں میں چھپوایا جائے گا۔ رام سنگھ اور شفیق کے فوٹو بھی

کئی اخباروں میں چھپے تھے جنہیں دیکھ کر جنیتو نے اپنا سر ح دوپٹہ کیچڑ میں مل لیا تھا
اور معصوم بشیرے کی روتے روتے گھگی بندھ گئی تھی۔ افریقی کی سرپٹ بھاگتی
ہوئی روح کو دیکھ کر بن کی اداس جھاڑیاں ایک دوسرے کی طرف جھک کر سرگوشیاں
کرنے لگیں "اب ہمیں کون البیلا مست ہو ہو کر اپنے گیت سنایا کرے گا؟"

فطرت نے ریلوے لائن کی پیٹھ پر تھپکی دی "گھبراؤ نہیں۔ چلو اب آگے بڑھیں
ہر عظیم کام کے لئے بلیدان دینا ہی پڑتا ہے"

ریلوے لائن فطرت کی چھاتی پر سر دھر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فطرت
نے اس کی بہت ڈھارس بندھائی۔ اس کے آنسو پونچھے اور پھر اس کی انگلی کو
ہاتھ میں لئے آگے بڑھنے لگی۔ راستے میں فطرت نے غمگین لائن کا حوصلہ بندھانے
کے لئے چاند تاروں کی موسیقی بھری سینکڑوں کہانیاں سنائیں لیکن لائن کسی
سہمی ہوئی پری کی مانند اپنے الم زدہ دل پر سر جھکائے چپ چاپ فاصلے طے
کرتی رہی۔ بیسیوں میل آگے بڑھ آئی۔ پھر ایک جگہ میلوں میں پھیلے ہوئے ایک
سلسلۂ کوہ نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"ہہ ہہ ہا۔۔۔ ہا ہہ ہا!" جیسے پہاڑ اپنے لمبے لمبے دانت نکال کر ریلوے
لائن کا مضحکہ اڑا رہا ہو "بتاؤ ننھی جان، اب آگے کیونکر بڑھو گی؟"

"دھائیں۔۔۔ دھا! دھائیں۔۔۔ دھائیں!!" بارود نے اچھل اچھل کر
پہاڑ کی تضحیک آمیز آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

"دھا۔۔۔ دھائیں!" اس کا سینہ چیر کر رکھ دیا۔ "دھائیں۔۔۔ دھائیں!"
جب پہاڑ کا کلیجہ ریزہ ریزہ ہو گیا تو لائن کے قدموں پر راستہ خود بخود خمیدہ ہو کر

کورنش بجالایا۔

نصرت نے اپنے عزیز کوہ کے وجود کو اس طرح چھلنی ہوتے دیکھا تو اس کی آواز گویا آنسوؤں کے سیلاب میں غوطے کھانے لگی "میرا یہ بچہ ـــــ یہ پہاڑ ہزارہا سال سے بڑی تمکنت سے کھڑا تھا۔ دیکھو موت کے باوجود اب بھی درمیان سے کٹ کر اُلٹے گرے ہوئے اس کے دونوں حصے کس قدر عظیم الشان نظر آتے ہیں۔ تمہارے پتھر دل آدمیوں نے میرے اس جلیل القدر بچے کی جان لے لی ہے۔ جی چاہتا ہے میں بھی ان سب کے پرخچے اُڑا دوں اور پھر تمہارا بھی گلا گھونٹ کر تمہیں پرے پھینک ماروں"۔

نصرت کے غصہ کو دیکھ کر لائن کانپنے لگی "لیکن نہیں" نصرت نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا "میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ میں نے تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مگر سُنو، اپنے آدمیوں سے کہو اتنے کٹھور نہ بنیں"

کچھ دور جا کر فطرت نے لپک کر لائن کو روک لیا "یہاں پھنکارتے سانپوں کے بے شمار کنبے پلتے ہیں، یہ دیکھو جگہ جگہ دھرتی میں سوراخ کر کے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔ یہ موذی بہت ظالم ہوتے ہیں۔ بہت سنبھل سنبھل کر قدم بڑھاؤ، اپنی آنکھوں کو چاروں طرف پھیلا کر سانس روکے ہوئے!

"بس اب تھوڑی دور اور چلنا ہے، پھر ہم ان موذیوں کی حد سے باہر چلے جائیں گے۔ شاباش! اب بے شک بھاگتے ہوئے آتھی ریور پہنچ جاؤ، وہاں سے اپنی منزل بہت قریب ہے"

اپنی منزل کی قربت کے خیال سے لائن اپنی تھکن بھول کر بھاگتی گرتی آتھی ریور

اور پھر تماشائیوں کے شادماں نعروں کو سنتے ہوئے نیروبی آپہنچی۔ اُس کے استقبال کے لئے ساری نیروبی ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر پاگل ہو اُٹھے۔ اُس کو خوش آمدید کہنے کے لئے باجے کی دھنیں قہقہے لگا لگا کر بجنے لگیں جنہیں سن سن کر لائن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ریلوے کے حاکم اعلیٰ شہر کے معزز ترین اصحاب کے ساتھ اُس سے ملنے کے لئے آگے بڑھ آئے۔

فطرت نے ریلوے لائن کو دور سے اپنے آدمیوں سے ملتے جلتے دیکھا تو چپکے سے پیچھے سرک کر بہت دور گھنے جنگلات میں لوٹ گئی۔

"کینیا!" صدی بھر قدیم سکاچ وسکی کے گلاس اوپر اٹھائے گئے۔

"کینیا!" سارا ملک صدائے بازگشت سے گونج اٹھا۔

ممباسہ اور نیروبی کے درمیان نئی ریلوے لائن پر انگلستان سے درآمد کردہ ریلوے انجن نہایت آرام دہ ریل کے ڈبوں کو فاتحانہ انداز سے تیز تیز کھینچتے ہوئے ان تاریک خطوں کو جلد جلد روشنی سے روشناس کرنے لگے گاڑی کی بے تحاشہ چھک چھک اور انجن کے کانوں کے پردے پھاڑنے والے وسل سے گھبرا کر فطرت ان خطوں کے اندرونی جنگلات میں ہٹنے لگی۔ خونخوار [illegible] ریل سے میلوں پرے بھاگ گئے۔ ریل کے آس پاس کے علاقوں میں جنگلات صاف کئے گئے اور وہاں کئی صاف ستھرے چھوٹے موٹے گاؤں بسنا شروع ہو گئے۔ ان بستیوں میں سرکار نے افریقن چیفس متعین کر دیئے جو سرکاری ہدایت کے مطابق کالے لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے۔ ہندوستانی بنیوں نے طرح

طرح کی دکانیں کھول لیں اور چونکہ ان دکانوں سے روپوں پیسوں کے بغیر مختلف ضروریات زندگی نہیں خریدی جا سکتی تھیں اس لیئے ان بستیوں میں بسے ہوئے کالے لوگ وزونگو کے مقرر کردہ چیفس کی سرکردگی میں انواع و اقسام کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرنے لگے۔

روپیہ کمانے کے لیئے کئی افریقن ریلوے قلی بن گئے۔ کئی ہندوستانی بنیوں کی دکانوں پر نوکر ہو گئے، کئی یورپین نوآبادوں کے نئے نئے قائم شدہ فارموں پر کام کرنے لگے، اور کئی ریل گاڑی میں سوار ہو کر کام کی تلاش میں ممباسہ یا نیروبی میں چلے گئے جہاں کچھ سرکاری دفتروں میں چپڑاسی ہو گئے کچھ اسماعیلیوں اور گجراتیوں کے کارخانوں میں مزدوری کرنے لگے۔ اور کچھ روٹی کپڑا اور پانچ دس روپے ماہوار پر انگریزوں کے ہاؤس بوائز اور ہندوستانیوں کے بوئی بن گئے۔ جنہیں کوئی کام نہ ملا وہ اپنے اپنے بار روزگار قبیلے والوں کی مدد سے کسی نہ کسی طرح گزر کرتے ہوئے تلاش معاش میں گھومتے رہتے۔ کہیں تھوڑا کام مل گیا تو پیٹ کی آگ بجھالی ورنہ کبھی کام دھندکان کی گالیاں کھا کر اور کبھی اپنے باکار ساتھیوں کو دوستی کا واسطہ دے کر گزارہ کر لیا اور اگر اس طرح بھی گزران نہ ہوئی تو کہیں چھوٹی موٹی چوری کر لی کیونکہ ان کے پہلے کالے چوروں نے جو چوری کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ انہیں بتایا تھا کہ وزونگو کی جیل میں بڑے مزے ہیں۔ وہاں ادھر ادھر بھٹکے بغیر کام مل جاتا ہے اور گو، چکولا اور جمبا مفت۔

"ہائیں اگو، چکولا اور جمبا مفت!؟" جسے باہر کوئی کام نہ ملتا وہ کوئی معمولی چوری کرتے ہوئے جان بوجھ کر خود کو گرفتار کروانے کی خواہش سے بے تاب نظر

آتا لیکن جب مالکان اُسے پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے گالیاں دیتے ہوئے دھکے مار مار کر باہر نکال پھینکتے تو وہ نہایت حسرت سے اپنی کسی خوش قسمت قیدی دوست کا خیال کر کے دل کو مسوس کر رہ جاتا۔

آہستہ آہستہ ہندوستانی قلیوں کا دور یکسر ختم ہو گیا۔ وہ اور اُن کے بیٹے خوشحال تاجر، درمیانہ درجہ کے کھاتے پیتے سرکاری ملازم یا کاریگر بن گئے۔ ان کی جگہ افریقی لوگوں نے بڑی ذمہ داری سے سنبھال لی۔ مانگی عین رام سنگھ بن گیا اور مٹیپے عین شفیق، کئی یورپین لوگ خوبصورت ہائی لینڈ پر جنگلات کو صاف کر کے بڑے بڑے فارموں کے مالک بن گئے اور سستے افریقی لیبر کی مدد سے دنوں مہینوں ہی میں لاکھوں سے کھیلنے لگے اور کئی اپر کلاس آفیشلز بن کر شاندار سرکاری دفاتر کو زینت بخشنے لگے۔

سرکاری رپورٹ کے مطابق کینیا کالونی کی معاشی حالت بتدریج بہتر ہوتی گئی۔ کالونی کی دولت سے متعلق کہانیاں سن سن کر ہر سال ہزار ہا نئے یورپین اور ایشین تلاش معاش میں یہاں آنے لگے۔ گورنمنٹ نو آبادی کو جدید اقدار کے مطابق خوب اچھی طرح بسانے کے لئے کئی اقسام کی اسکیمیں تیار کرنے لگی جنگل کٹتے گئے۔ ملک کی چاروں طرف نئی ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھتا گیا۔ پھر چھوٹی چھوٹی بستیاں نئے نئے کپڑے پہن کر شہروں کی مانند نظر آتے ہوئے مٹک مٹک کر چلنے لگیں اور کئی اور جنگلات نے معمولی بستیوں کا لبادہ اوڑھ لیا۔

تاریک خطے کے خدا اور رئیس نے اپنی ہار قبول کر کے اپنا تاج نئی تہذیب کے

خوبصورت دیوتا جیو پٹر کے سپرد کر دیا۔

ہوتے ہوتے چھوٹے چھوٹے مقامات پر کام کی نایابی کے سبب سے کالے لوگوں کی بھاری تعداد شہر کی جانب منہ موڑنے لگی۔

"جہاں اتنے لوگ بس رہے ہیں وہاں ہم بھی جینے کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ نکالیں گے۔" شہروں کے افریقی علاقے لبالب بھرنے لگے، اتنے بڑے ہجوم کے بچوں کے لئے اور زیادہ اسکول کہاں سے آتے؟ کالے لوگوں کے ہسپتالوں کے لئے پہلے ہی اس قدر خرچ کیا جا چکا تھا، مزید ہسپتال کیونکر بنتے؟ پہلے ہی ہزارہا اشخاص کو کام دلوایا جا چکا تھا اور کچھ اور کا بھی بندوبست کیا جا سکتا تھا لیکن اس جم غفیر کا کوئی معقول انتظام کرنا بھلا کیونکر ممکن تھا؟ جسے دیکھو شہروں ہی کی طرف منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔

"کالے لوگ نرے جاہل ہوتے ہیں۔"

"گاؤں سے بچ کر رہو۔ بڑی خطرناک قسم کے امراض کا شکار ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

"اتنے کالے بیکار، آوارہ پھر رہے ہیں، سرکار انہیں جیل میں کیوں نہیں ٹھونس دیتی؟"

کئی بیکار افریقی گمراہ ہو جاتے اور سگریٹ کا دھواں نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے عادی بدمعاشوں کی مانند مشکوک ٹیڑھے میڑھے انداز سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر موقع کی تاک میں آوارہ گھومتے پھرتے۔ کئی حوصلہ چھوڑ کر واپس گاؤں میں چلے جاتے لیکن پھر تھوڑے دنوں بعد شہر میں لوٹ کر کام کی تلاش شروع

کر دیے۔

کالونی ترقی کرتی گئی۔ نوآبادوں کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا گیا، نئے نئے پروجیکٹس کو مکمل کرنے کے لئے اور زیادہ افریقیوں کو کام ملتا گیا، اور زیادہ افریقی شہروں میں وارد ہوتے گئے اور زیادہ افریقی بے کار ہوتے گئے، اسکولوں، ہسپتالوں اور اعلیٰ تعلیم کے وظائف کے باوجود افریقی جاہل، بیمار یا بدمعاش ہوتے گئے۔

یہ نیروبی! ایسٹ افریقہ کا دل، جس کی دھڑکنوں کا وجد آفریں راگ سنتے ہوئے لاکھوں فارغ البال یوروپین اور ایشین سر دھن رہے ہیں۔ نیروبی میں ہر جگہ بچھی ہوئی ملائم، کشادہ ٹارمیکاڈم سڑکیں، جن پر آدمیوں کی بجائے موٹر کاریں قطار در قطار رواں دواں نظر آتی ہیں اور جن کے درمیان بے شمار ہموار، سرسبز جزیرے سجے بیٹھے ہیں، جہاں اُگے ہوئے خوش رنگ خوشبودار افریقی پھول بازار میں سنگھار کر کے بیٹھی عورتوں کی مانند ایک آنکھ میچ کر موٹر سٹس کو خنداں اشاروں سے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ سڑکوں کی دونوں طرف خوشنما مغربی طرز کی دکانوں کے آگے جدید ترین اسٹائل کے کاریڈارز، جہاں لیٹسٹ وضع کی سکرٹیں پہنے نوعمر شیریں یوروپین لڑکیاں اپنے عشاق کے بازوؤں میں بازو دیئے کسی شو ونڈو کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ”ہاؤ بیوٹی فل! ڈارلنگ، لے دو نا!“

یہ کاریڈارز، جہاں نئے بیاہے ہوئے خوش پوش ایشیائی جوڑے جینو اور لعل سنگھ کے المیہ سے قطعاً ناآشنا ہنسی کھیل میں کھڑے کھڑے ہزار پانچ سو کی شاپنگ کر لیتے ہیں!

یہ کاریڈارز، جنہیں افریقن بھنگی ہر شام کو صاف کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ اگر وہ کبھی یہاں ایک دکان کا مالک ہوتا تو اس کے پاس کتنے شلنگ ہوتے۔

"اتنے!" وہ کام کرتے ہوئے رک جاتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو چپٹا جوڑکر ان کی جانب دیکھنے لگتا ہے، گویا ان پر شلنگوں کا ڈھیر لگا ہو۔ "نہیں، اتنے!" وہ ہاتھوں کو علیحدہ کر کے انہیں پھیلا کر سوچنے لگتا ہے اور پھر جیسے ہاتھوں کے درمیان کھلے حصہ سے شلنگ چھن چھن نیچے گرنے لگے ہوں وہ جھٹ اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو پھر پہلے کی طرح چپٹا کر کے جوڑ لیتا ہے۔ "اتنے ہی کافی ہیں"۔

یہ کاریڈارز، جن کے پہلوؤں میں ہر سال کئی سکائی سکریپر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پچاس سال قبل کی نیروبی کا تصور باندھے تحقیر سے ہنسنے لگتے ہیں۔ ان سکائی سکریپروں میں بے شمار دفاتر ہیں، دنیا کی بڑی بڑی ایئر سروسوں کی لوکل برانچیں، جہاں ہزار ہا میل سے آئے ہوئے مسافروں کا استقبال کیا جاتا ہے اور ہزار ہا میل دور چھٹی پر گھر جانے والے مسافروں کو ہزار ہا شلنگ کی قیمت پر ہوائی ٹکٹ دیئے جاتے ہیں۔ غیر ممالک کے گڈول مشنز کے دفاتر، جہاں افریقی لوگوں کی بہبودی سے متعلق جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ امپورٹس اور ایکسپورٹس کی کمپنیاں جو افریقی گوشت، مکھن، روئی اور طرح طرح کے مقامی عجوبے باہر بھیجتی ہیں، اور باہر سے موٹر کاریں، عمدہ ریڈی میڈ کپڑے، عطریات اور الیکٹرک کوکر اور ریفریجریٹر وغیرہ منگواتی ہیں۔

نیروبی کا یہ سب سے بڑا بنک، جس کے اندر سینکڑوں ملازمین اور گاہک دولت کا لین دین کر رہے ہیں اور جس کے دروازے پر ایک نوجوان، میٹرکولیٹ

افریقی گونگو کے عالم میں کھڑا سوچ رہا ہے کہ وہ اندر جا کر اپنی ملازمت کی عرضی سے متعلق پوچھ تاچھ کرے یا ابھی دو چار روز اور انتظار کرے۔

کسی نہایت خوشحال ایشین کا یہ خوبصورت بنگلہ، جس کے دروازے پر پانچ چھ فاقہ مست افریقی گھر کی مالکن سے پوچھ رہے ہیں "ماما، بوئی کا کام ہو گا؟"

"جاؤ، جاؤ، اپنی راہ لو۔ موئے پہلے ہی دو مسٹنڈے موجود ہیں"

ہتھیلیاں ملتا ہوا ایک بے بس کالا ٹیکسی ڈرائیور، جو نہایت عاجزی سے اپنے مالک سے درخواست کر رہا ہے "صاحب، اس دفعہ معاف کر دیں، مجھے کام سے نہ نکالیں، صرف ایک موقع اور دیں" اور قریب ہی کھڑا اس کا ایک افریقی بھائی ڈرتے ڈرتے سوچ رہا ہے کہ اگر مالک نے اس کی درخواست قبول کر لی تو اُسے کام کیونکر ملے گا؟

"ہہ ہہ ہا ـــ ہہ۔ روپے؟ ہم سپلی چٹی دھاتوں کے ان گول مٹول ٹکڑوں سے کیا کریں گے رفیقی؟ ہہ ہہ ہا"

"ہم بیمار ہیں!"

"علاج کے لئے شلنگ لاؤ۔ یہ کوئی خیراتی ہسپتال نہیں"

"ہم بھوکے ہیں!"

"چکولا مفت نہیں ملتا"

"ہمارے بچے آوارہ پھر رہے ہیں!"

"مگر اتنے سکول بنوانے کے لئے سیمنٹ کہاں ہے؟"

شلنگ ۔۔! سینٹ !! پیلی چٹی دھاتوں کے ان گول مول ٹکڑوں کے بغیر
کچھ نہیں ہو سکتا!

یہ نیروبی!

یہ ممباسہ!

یہ نکورو!

تاریک براعظم کا روشنی سے جگمگاتا ہوا یہ خطہ!!

پیلی چٹی دھاتوں کے یہ گول مول ٹکڑے!!!

"جب کسی جاندار کی اولین ضروریات کا انحصار کسی مخصوص سسٹم کی پابندی پر ہو تو وہ شروع شروع میں بے شک چون و چرا کرے لیکن بعد میں عادتاً وفادار بن جاتا ہے۔"

"بیکار کیوں پھرتے ہو؟ اگر پیٹ بھر کر روٹی کھانا ہے تو کام کرو۔ ایمانداری سے کمائی کرو۔"

"کام!؟ کہاں ہے کام؟"

"ڈھونڈو۔ ڈھونڈنا تمہارا کام ہے۔ جوئندہ یابندہ۔"

نیروبی اور ممباسہ کے درمیان دوئی کے ریلوے جنکشن پر دو ریل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آج سے کئی سال پہلے یہاں دشوار گذار گھنے جنگلات کا لگاتار سلسلہ تھا لیکن آج یہاں بے حد بھیڑ بھاڑ کا عالم تھا پلیٹ فارم پر کھڑی ایک گاڑی ممباسہ سے نیروبی کی جانب جا رہی تھی اور دوسری نیروبی سے ممباسہ کی طرف۔ دونوں گاڑیاں

کے تھرڈ کلاس کے ڈبوں سے دو کالے نوجوان باہر نکلے۔ زرد رو، مضمحل اور پژمردہ،
دونوں پلیٹ فارم پہ لگے ہوئے پانی کے نل کے قریب آ کھڑے ہوئے۔
منہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جامبو، رفیقی۔"

"جامبو۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"نیروبی۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ممباسہ سے۔"

"لو، سگریٹ پیو، رفیقی۔ وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

"کام کی کھوج میں۔ تم کہاں جا رہے ہو، رفیقی؟"

"ممباسہ۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"نیروبی سے۔"

"کیوں جا رہے ہو وہاں، رفیقی؟"

"کام کی کھوج میں۔"

ملٹی ریشل

پارلیمنٹ ہاؤس کی پبلک گیلری لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بنچوں پر قطار در قطار بیٹھے ہوئے افریقیوں ایشیائیوں اور یورپینوں کے کالے، براؤن اور سفید چہرے اس طرح لگ رہے تھے جیسے وہاں کسی عظیم فنکار کا ملٹی ریشیل سوسائٹی سے متعلق ایک نہایت عمدہ اشتہاری پوسٹر چھپا ہو۔

ملٹی ریشیل سماج کے علمبردار آنریبل کمار نے مسکراتے ہوئے اپنی ٹائی کی ناٹ کو درست کیا اور ہاؤس کے روبرو نہایت تحمل سے آج کا موشن پیش کرتے ہوئے کہا "گورنمنٹ کو اس ملک کی زندگی کے ہر شعبہ میں ملٹی ریشیل سوسائٹی کے اصول کو بروئے کار لانے کے لئے فوری اقدام کرنا چاہیئے۔"

پبلک گیلری کی پہلی صف میں بیٹھے ایک افریقی نے خوش ہو کر اپنا دایاں بازو ذرا اونچا کر کے اسے انجانے میں پہلو کے ایک انگریز کی پشت پر ٹکا دیا اور جب وہ انگریز ناک بھوں چڑھاتے ہوئے تیزی سے پرے ہٹا تو افریقی بمشکل منہ کے بل گرتے گرتے بچا اور اس کے چہرے کی سیاہی شرمندہ ہو کر دیر تک

ہنستے ہوئے نظر آنے کی کوشش کرتی رہی۔

اپنے لہجہ کے خلوص سے متاثر ہو کر آنریبل کمار کی مسکراہٹ مزید شگفتہ ہو گئی "ہمارا ملک دراصل ہمیں ایک زریں موقع دے رہا ہے کہ ہم ہمہ گیر برادری کے خوش آئند خوابوں کے اولین معمار بن جائیں اور نسلی امتیاز کو عملی طور پر نابود کرنے کے لئے پیش قدمی سے کام لیں۔"

لیجسلیٹو کونسل کے ایک ترقی پسند انگریز ممبر آنریبل لائبرٹ نے اپنے ایک ساتھی کو ٹھوکا دیتے ہوئے آہستگی سے کہا "تعجب ہے آنریبل کمار ایشیائی ہونے کے باوجود اتنی شستہ انگریزی بولتا ہے۔"

"ایشیائی ممبروں میں یہی ایک آدمی کام کا ہے۔" وہ دونوں آنریبل کمار کی طرف حوصلہ افزا نظروں سے دیکھنے لگے۔

"یہ محض اتفاق نہیں کہ ہم تینوں قومیں اس تاریک براعظم میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ بلکہ فطرت کو انسان کے اس دعوے کی آزمائش مطلوب ہے کہ اس کی قومیت کا نام انسانیت ہے، کہ اس کی بہترین صلاحیتیں اُس وقت اُجاگر ہوتی ہیں جب وہ دنیا بھر کے لوگوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر ان کے ساتھ گھل مل کر رہتا ہے۔

"مسٹر سپیکر اینڈ دی آنریبل ممبرز نیویارک سے اقوام متحدہ کی جماعت شاید وہ کام کرنے سے قاصر ہو جو آپ یہاں اپنی ملٹی ریشل سوسائٹی کی صحت مند نشوونما سے بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوموں کے باہمی اعتماد کی بات کرنا شاید ایک سیاسی مصلحت ہے۔ لیکن آپ کے لئے یہ موضوع روزمرہ کی ایک زندہ حقیقت ہے اب خواہ آپ اس حقیقت کا گلا گھونٹ کر قاتل کہلائیں خواہ

اس بچے کو کسی ماں کی طرح بڑے پیار سے پال پوس کر بڑا کریں۔ تاکہ سارا زمانہ اس کی توانائی محسوس کرنے لگے۔ حضرات ہم مائیں ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو قتل نہیں کرتیں بلکہ اپنا خون دیکر بھی اُن کی پرورش کرتی ہیں۔"

آنریبل کمار اپنے اس استعارہ کو اور زیادہ لمبا کرنا چاہتا تھا مگر شدتِ جذبات سے اس کا گلا سوکھنے لگا اور وہ سامنے میز پر رکھا ہوا پانی پینے کے لئے ذرا رُک گیا۔

افریقن ممبر سر اٹھا کر آنریبل کمار کی طرف استعجاب و تحسین سے دیکھنے لگے جیسے پُرانے زمانے میں اُن کے غیر مہذب آباؤاجداد آسمان سے سرگوشیاں کرتی ہوئی کسی متبرک پہاڑ کی چوٹی کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے منہ کھلے چھوڑ دیتے تھے۔

"میں اس امر کو افریقن تاریخ کا سب سے بڑا المیہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے باپ دادا اپنے اپنے تعصبات کا شکار بنے رہے ایک دوسرے کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتے رہے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی ایسا طرز زندگی اختیار کئے رکھا گویا ہم تین مختلف قومیں ہیں اور ایک دوسرے سے ہزار ہا میل دور تین علیحدہ علیحدہ براعظموں پر سکونت پذیر ہیں۔

"آنریبل ممبرز! میں آپ سے ایک سادہ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں کہ آخر لفظ 'قومیت' کی تعریف کیا ہے۔ اگرچہ ہم میں سے ایک معمولی اقلیت بہت رجعت پسند واقع ہوئی ہے مگر مجھے کامل یقین ہے کہ ایک بھاری اکثریت کا ترقی پسند زاویۂ نگاہ میرے طرز فکر سے مختلف نہیں ہوگا۔"

تقریباً سب آنریبل ممبران یہ سوچ کر نہایت محظوظ ہوئے کہ وہ آنریبل کمار کے ترقی پسند گروپ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

"میرے سوال کے جواب میں ہمارے اس اہم مسئلہ کا حل مضمر ہے مجھے بتائیں کہ جب ہم کسی قوم کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد کن لوگوں سے ہوتی ہے

"مجھے آپ کی ذہانت پر قطعاً شک نہیں۔ آپ کی عالمانہ نگاہیں مجھے وہی جواب دے رہی ہیں جو میرے ذہن نے مجھے دیا ہے کسی قوم کا خیال ہمارے رو برو ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس کی بدولت اس قوم کے لوگ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر ایک دوسرے کے تابع ہوں، کیا یہاں اس جنت نظیر ملک میں افریقی اور یورپین اور ایشین لوگ اپنی اپنی بہبودی کے لئے ایک دوسرے کے پابند نہیں؟ کیا ہماری ترقی کا انحصار ایک دوسرے کی ترقی پر نہیں؟ حضرات، میں اپنے سوال کے جواب کے لئے ذرا دم لینا چاہتا ہوں۔"

آنریبل کمارے نے کسی محبوب فلمی اداکار کی طرح تماشائیوں کی طرف دیکھا اور دم لینے کے لئے پھر پانی کے گلاس کو منہ سے لگا لیا۔ اس کے گروپ کے آنریبل ممبر فخرمندی سے مسکراتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ گویا کہنا چاہتے ہوں "دیکھا ہمارا ایشین گروپ لیڈر؟ اگر ہمت ہو تو اس کے بیان کی تردید کرو"۔

"جناب من"۔ آنریبل کمارے نے اسپیکر کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے پر اعتماد لہجہ میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس کی ایک بھاری اکثریت اس بات میں مجھ سے متفق ہے کہ ہمارے خوبصورت ملک میں در اصل تین مختلف قومیں نہیں بستیں، بلکہ یہاں سب لوگ صرف ایک ہی قوم سے متعلق ہیں، ہم سب افریقن ہیں!"

"ہیر! ہیر!" ایک افریقن ممبر نے بے اختیار کہا، اپنے مضبوط اور جڑے جڑے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس کے چہرے کی تابناک سیاہی کھلکھلا کر

ہانپنے لگی۔

"ممبرز!" ایک بیدار مغز انگریز بھی اپنی آواز میں دباؤ پیدا کرنے کے لئے اپنے مصنوعی دانتوں کو منہ میں اچھی طرح سیٹ کر کے بول اُٹھا۔

"حضرات! ہماری سوسائٹی ایک انسٹر لیقن سوسائٹی ہے، ایک ملٹی ریشل سوسائٹی، جس کے تمام اراکین اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی طور پر برابر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس حقیقت کے پس منظر پر ہماری تہذیب میں یکسانیت کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔"

گیلری میں بیٹھی پبلک کے لبوں پر محویت میں یکساں مسکراہٹیں کھیلنے لگیں یکایک ہوا کی خنکی سے ایک افریقن اور ایک فرانسیسی کو چھینکیں آنے لگیں۔ فرانسیسی نے بڑے مہذب طریق سے اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب سے ایک آہن شدہ خوبصورت رومال نکالا اور بڑے سلیقہ سے اسے اپنی ناک پر رکھ لیا۔ افریقن کی کسی اندرونی جیب میں ایک گندہ سا رومال موجود تو تھا لیکن کچھ ساری زندگی رومال کے مناسب استعمال کا عادی نہ ہونے اور کچھ اپنے غلیظ رومال کی بدبو کے احساس سے اس نے اسے وہیں اپنی اندرونی جیب میں رہنے دیا۔ اس کی ناک اور منہ سے پانی کی ہلکی ہلکی دو چار بوندیں ایک نہایت دلکش ایشیائی خاتون کے بائیں رخسار پر آگریں۔

"بدتمیز!" ایشیائی خاتون نے چہرے پر نفرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "تہذیب چھو بھی نہیں گئی ان جنگلیوں کو۔"

"آنریبل ممبرز، ہماری تہذیب ایک ہے۔ پھر ہم اپنے چھوٹے چھوٹے طبقاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر کیوں نہ اپنے اس ملٹی ریشل کلچر کے اصول کے لیے خوشگوار فضا

پیدا کریں۔ اپنی قومی زندگی کے ہر پہلو میں اس یک جہتی کی دائمی زندگی کے لیے کوشاں ہوں؟ اب وقت آگیا ہے جب ہم اپنی مصنوعی علیحدگی کو توڑ پھوڑ کر اپنی عام زندگی میں اکٹھے نظر آئیں، ہمارے بچے ملٹی ریشل اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں اور ہم سب کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ ایک سا ہو تاکہ ہر ممکن طریقہ سے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آکر دنیا کے لئے ایک مثالی ملٹی ریشل سماج کی تخلیق کر سکیں۔"

تقریر سے متاثر ہو کر ایک بوڑھا انگریز لیسوتو مسیح کو یاد کرنے لگا اور اپنے پہلو میں بیٹھے ایک ایشیائی نوجوان کو اپنے نہایت قیمتی سگرٹوں کے ڈبہ میں سے ایک سگریٹ پیش کیا۔ وہ حسین ایشیائی خاتون بھی اس افریقن کی پھبتیاں بھول گئی اور اس کی مسکین صورت پر ترس کھانے لگی پھر جب اس نے ذرا منھ مارنے کے لئے اپنا چیونگ گم کا ڈبہ کھولا تو اس کا جی چاہا کہ یہ سارا ڈبہ اس افریقن کے حوالے کر دے۔

"آنریبل ممبرز اس سے پہلے کہ آپ میری اس تحریک پر مزید بحث کریں میں آپ کو متنبہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس امن پرور، انسانیت نواز تحریک کی مخالفت کرنا ہمارے لئے خودکشی کر لینے کے مترادف ہوگا۔

"صاحبان، کیا آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں؟"

سب نے اپنے گلوں سے علیحدگی کا پھندا اتار پھینکا اور کسی واحد خاندان کے افراد کی طرح شفقت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے حیات بخش احساسات کی گرمی سے خنک موسم میں حدت سی آگئی۔

آنریبل کمار اس فیملی کے باپ کی طرح اپنے بچوں کو آپس میں پیار سے کھیلتے

ہوئے دیکھ کر مسرت سے اپنا سر ہلانے لگا۔

لنچ ٹائم ہو گیا تھا اس لئے مزید بحث سے پہلے مجلس دو گھنٹے کے لئے اُٹھ گئی۔

"مبارکباد" آنریبل کمار! میں آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوں" لیجسلیٹو کونسل کا ایک افریقن ممبر بڑے تپاک سے آنریبل کمار سے ہاتھ ملانے لگا۔

"بہت خوب، آنریبل کمار! میں بنیادی طور پر آپ سے متفق ہوں مگر بعض امور ہنوز بحث طلب ہیں" ایک محتاط یورپین ممبر کہنے لگا۔

"کمار صاحب! آپ بہت اچھا بولے ہیں" ایک ایشیائی ممبر اپنے عظیم لیڈر کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "اب لنچ کے لئے گھر کہاں جائیں گے، چلئے یہیں کسی ریستوران میں کھانا کھا لیتے ہیں"

"مجھے بہت پیاس لگی ہوئی ہے کہیں بیٹھ کر پہلے بیئر پیتے ہیں"

پارلیمنٹ ہاؤس سے باہر تھوڑی دور جا کر آنریبل کمار اور اس کا ساتھی ایک بار کے مقابل رک گئے۔ بار کے اندر قدم رکھتے ہوئے آنریبل کمار نے دیکھا کہ وہاں صرف افریقی لوگ ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔

"یہ تو کوئی افریقن بار معلوم ہوتا ہے۔ چلئے کسی اپنے بار میں جا کر بیٹھتے ہیں" آنریبل کمار نے بڑے خیال میں کہا اور وہ دونوں اُلٹے پاؤں باہر چلے گئے۔
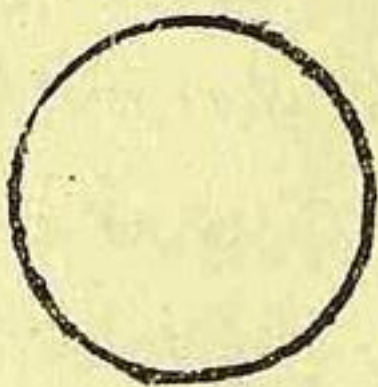
○ یہ ہماری دنیا کی شکل ہے، جیسے کسی نہایت فربہ اندام شخص کے گول مٹول پھولے پیٹ میں کئی بھیانک بیماریوں کے خوفناک بے شمار جراثیم کلبلاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی حمد میں لکھی ہوئی ہزاروں مشرقی نظمیں پڑھ کر پہلا احساس یہی ہوتا ہے کہ ہماری دُنیا دراصل ایک بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ اس پاگل خانے میں ان گنت قومیں بستی ہیں، پاگل، نیم پاگل اور ہوشمند، لیکن ہوشمند قومیں کو پاگلوں اور نیم پاگلوں سے زیادہ پاگل ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو سچ مچ ہوشمند سمجھتی ہیں۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ذی ہوش قومیں کسی عالمگیر امن کانفرنس میں بڑے دھیمے خوش کن لہجے میں تعمیر، صلح و آشتی کی باتیں کرتے کرتے ایکا ایکی سارے جہاں کو ہائیڈروجن بم سے تباہ کرنے کی کھلی دھمکیاں دینے لگتی ہیں۔ جیسے کوئی خطرناک پاگل بڑے پیار اور تحمل سے بات چیت کرتے کرتے اچانک چاقو نکال کر بلاوجہ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ بہر حال جس طرح کسی پاگل کی دیکھ بھال کے لئے چند ہوشمند کارکنان کا ہونا لازم ہے۔ اسی طرح پاگلوں سے لدی پڑی اس دنیا میں چند ہوشمند قوموں کے بغیر گذارہ نہیں خواہ وہ قومیں برائے نام ہی ہوشمند کیوں نہ ہوں۔

⑤ اس بیضوی پاگل خانے کے اندر ایک اور پاگل خانہ ہے۔ ایک اور دنیا' افریقہ۔

ایک زمانہ تھا کہ یہاں کی گھنی تاریکی میں، سانپوں، شیروں، ہاتھیوں اور وحشی انسانوں کے بھاری قہقہوں کی صدائیں اس طرح آزادانہ دوڑی پھرتیں جیسے کسی معصوم خوابیدہ بچّے کی بند آنکھوں میں بے شمار انجان مبہم خوشیاں! مگر سورج کے نکلتے ہی خوابیدہ بچہ بلکتا ہوا جاگ اٹھا، شاداں تاریکیاں نہ جانے کہاں کھو گئیں۔ جب مہذب قومیں بھوک سے پاگل ہو کر خوراک سونگھتے سونگھتے یہاں پہنچیں تو ان کی تہذیب کی مشعلیں ساحل سے کئی جلتی ہوئی لکیریں بن بن کر براعظم کے اندر اپنا راستہ بنانے لگیں۔ تاریکی میں اِدھر اُدھر اچھلتے بے پرواہ بھاری قہقہے ان جلتی لکیروں کو اپنی جانب لپکتے دیکھ کر خوف و تحیّر سے ٹھٹھرے، رہ گئے اور پھر بے اختیار رونے لگے یک بیک چاروں سمت شعلے ہی شعلے نظر آنے لگے، بھیانک شعلے، جن میں انجانے جانوروں کی کربناک دھاڑیں جلتی رہیں، حبشیوں کی سوزاں آہیں تڑپتی رہیں، خوبصورت ننھے منّے ہم نِدوں کے گیت سلگتے رہے۔ لاکھوں حبشیوں کو غلام بنا کر ساحل پر لایا گیا۔ اُنہیں مویشیوں کی مانند سمندری جہازوں میں لاد کر یورپ اور امریکہ بھیجا گیا۔ راستے میں کئی حبشی غلام موقع پا کر سمندر میں کود جاتے اور پھر ان کی روحیں تیزی سے پرواز کرتی ہوئی گھر لوٹ آتیں، اپنے گریاں بچوں کو کلیجہ سے لگا لیتیں۔

"ہندی!

"بیٹے"!

"ڈیبی!

مہندی، مٹے اور تریپ۔ سب بچوں کو محسوس ہوتے لگتا کہ ان کے گمشدہ باپ اُنہیں بازوؤں میں لئے، سینوں سے چمٹائے بے سدھ ہو ہو کر چوم چاٹ رہے ہیں مگر پھر اُنہیں اپنے پاس نہ پاکر ان کا پیار ہچکیاں بھرنے لگتا، وہ بھاگ کر اپنی اُداس ماؤں کے پاس چلے آتے اور ان کی گودوں میں سر دیئے روتے روتے ان کی گھگی بندھ جاتی۔

"پاگل!"۔ یورپی تمدن آہ وزاری کرتے ہوئے ان وحشیوں کا واویلا سُن سُن کر متعجب ہوا اُٹھا، گویا انسانی دُکھ کو محسوس کرنے کا نا اہل ہو!

"پاگل!" حبشی اپنی جنگلی زبانوں میں فریادیں کرتے رہے۔

"پاگل!" یورپی لوگ یہ انجان بولیاں کیونکر سمجھ پاتے۔؟

آخر کئی سو سال بعد یورپی اقوام کا خوابیدہ ضمیر کروٹ بدلتے ہوئے ہڑبڑایا۔ مصنفین نے حبشیوں کا دُکھ کچھ ایسے ڈبڈبائے پیرائے میں بیان کیا کہ بے شمار پادری ڈاکٹر بائبل کی کاپیاں اور دوائیوں کے ڈبے اٹھائے یہاں دوڑے چلے آئے۔ حبشیوں کے روحانی اور جسمانی زخموں کو دھونے کے لئے۔

لیکن کسی قوم کی ترقی کے لئے صرف پادری اور ڈاکٹر ہی کافی نہیں ہوتے۔ اگر افریقہ کی چھپی ہوئی دولت کو دریافت کرنے کے لئے انواع و اقسام کے ماہرین یہاں نہ آتے تو آج بھی یہ برّاعظم ساری دنیا سے الگ تھلگ تاریکی میں بھیانک خراٹے بھر رہا ہوتا، سونے کی کانیں دریافت نہ ہو سکتیں، جہاں ہزاروں لاکھوں افریقی مزدور کام کرتے ہیں، یورپی لوگوں کے سرسبز لہلہاتے کھیتوں کی بجائے چاروں طرف ویران جنگلات بھائیں بھائیں کر رہے ہوتے اور متمدن مغربی حکومتوں کی بجائے ابھی تک بربریت کا دور دورہ ہوتا۔ یورپیوں نے یہاں کے جنگلی باشندوں کو تعلیم دے کر

انہیں انسان بنایا جانداروں کو پالتو بنانا مقصود ہو تو پہلے انہیں انسان ہی بنایا جاتا ہے) انہیں کپڑا پہننا سکھایا (پھٹے پرانے چیتھڑے ہی مہیا ہونے کے باوجود وہ اپنے ننگے دھڑنگے آبا و اجداد سے بہت بہتر تھے) ان کے لئے جدید وضع کے مکانات تعمیر کرائے (جب باہر سر ڈھانپنے کو جگہ میسر نہ تھی تو دس بارہ افراد صرف ایک ہی کوٹھری میں رہ کر بھی مولا کا شکر ادا کر لیتے ہیں) اور کشادہ سڑکیں بنوائیں جن پر سرپٹ بھاگتی ہوئی لاتعداد موٹر گاڑیاں اکثر پیدل چلنے والے مزدوروں اور بے کار اچکوں کو روند جاتی ہیں (لیکن جو کالے ٹریفک کے آداب سے آشنا ہوتے ہیں انہیں صرف ایسی گاڑیوں سے ہی خطرہ لاحق ہوتا ہے جن کے متمول ڈرائیور شراب کے نشے میں بدمست ہوں یا جو ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی محبوباؤں سے عشق فرما رہے ہوں۔)

کئی اجنبی یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوتے ہیں کہ چند افریقی بالکل یورپیوں اور ایشیائیوں کی طرح ہی وکیل، ڈاکٹر یا پروفیسر ہیں اور اپنا کام کرتے ہوئے بالکل ان ہی کی مانند مستعد نظر آتے ہیں، مگر یہ تعجب دراصل نوآبادیوں سے بے انصافی کے مترادف ہے۔ اگر یہ اجنبی لحہ بھر کے لئے نوآبادیوں کی ان لگاتار کوششوں کا خیال کریں جن کی بدولت کالے لوگوں کو اس رتبہ تک پہنچنا نصیب ہوا تو پھر انہیں تعجب نہ ہوگا۔ ابھی پچھلے سال ہی کی بات ہے کہ افریقہ کی صرف ایک ہی سرکار نے پورے پندرہ سو افریقیوں کو ٹیلیفون آپریٹر کے کام کی تربیت دی۔ کل تک یہ لوگ اپنے سامنے کھڑے آدمی سے انگریزی کے دو لفظ بھی بولنے سے قاصر تھے لیکن آج اگر آپ انہیں کبھی ضرورتاً فون کریں

تو آپ کو احساس کمتری محسوس ہونے لگے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی بی بی سی سے بول رہا ہو، نہایت مہذب، صریح اور رواں۔

شاید آپ کو کبھی ان لوگوں کی عورتیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ساؤتھ افریقہ سے ایک بھلا سا ماہنامہ نکلتا ہے "ترم" اس رسالے میں اگر آپ کالی میموں کے نئے نئے پوز دیکھیں تو دنگ رہ جائیں، انھیں دیکھ کر ہالی ووڈ کی تتلیاں بھی چکرا کر رہ جاتی ہیں۔

لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، اس عظیم ترقی کے باوجود کئی سال سے اس کالی دھرتی کے کونے کونے سے بے پایاں ہنگامہ اُٹھ رہا ہے، گو کسی پاگل خانے میں سب بھائی لوگوں کے من میں کوئی ترنگ اُٹھی ہو اور سب مل کر بہ یک آواز زور زور سے نعرے لگانے لگے ہوں، آزادی کے نعرے!

آہو رُو!

ارے ویلانو! آخر کس بات کی آزادی چاہتے ہو؟ واپس غاروں میں جانے کی آزادی؟ بھوکا ننگا رہنے کی آزادی؟ اپنے آپ کو بے وقوف بنانے کی آزادی؟

انقلاب زندہ باد!

اتنا چلاّ کیوں رہے ہو؟ اپنی نئی نئی حاصل کردہ تعلیم کو بروئے کار لاکر ذرا خاموشی سے اس انقلاب کا مطالعہ کرو جو تمہارے محسنوں کی ان تھک جد و جہد سے پہلے ہی تمہاری زندگی میں رونما ہو چکا ہے۔

افریقہ ہمارا ہے!

سپوتنک کے اس دور میں جب خدا کا خلا اس کا اپنا نہیں رہا تو تم کس

باغ کی مولی ہو؟ پاگلوں کی بے معنی چیخ پکار پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ مزید ترقی کے خواہاں ہو تو پہلے اپنے بگڑے دماغوں کا علاج کرو۔

(۵) افریقہ کے اندر یہ ایک اور پاگل خانہ ہے، نیروبی، جہاں کالے افریقی، گورے یورپی اور زرد ایشیائی اس لئے ایک دوسرے کی جانب مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہیں، کہ انہیں ایک دوسرے سے نفرت ہے۔ کئی مقامی ایجنٹوں نے نہایت خوشنما آرٹ پیپر پر بے شمار رنگ دار پمفلٹ شائع کر رکھے ہیں جن میں یورپی لیڈرشپ کے زیر سایہ اس شہر کی گذشتہ پچاس سالہ حیرت انگیز ترقی کی ایک واضح جھلک ملتی ہے۔

یہ دیکھیئے اس پمفلٹ میں امریکی اسٹائل پر تعمیر کردہ شاندار ہوٹلوں کی دلفریب تصاویر ہیں۔ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے آپ صرف پچاس شلنگ روزانہ ادا کر کے یہاں کسی ہوٹل میں زندگی کے سارے سکھ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک اور پمفلٹ ہے جس میں شہر کے کئی قابلِ دید مقامات سے متعلق ضروری اطلاع بہم پہنچائی گئی ہے۔ یہ سٹی پارک ہے جہاں اتوار کی ہر شام کو ماہرین موسیقی کے مختلف گروپ انگریزی بینڈ بجاتے ہیں، گاہے گاہے دنقوں پر تاش کھیلتے اور گپیں ہانکتے ہوئے تماشائی گھڑی بھر کے لئے تاش کھیلنا یا گپیں ہانکنا بند کر دیتے ہیں تاکہ خوب زور زور سے تالیاں بجا کر ماہرین موسیقی کی حوصلہ افزائی کریں۔

یہ تصویر نیشنل پارک کی ہے یہاں شیر، ہاتھی اور گینڈے وغیرہ کھلے بندوں پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس پارک میں داخل ہوتے ہوئے سرکاری ہدایت کے

مطابق آپ کو اپنی کار کے سب شیشے بند رکھنے پڑتے ہیں۔ اگر آپ اپنی کار شیروں کے کسی گروہ کے پاس لا کھڑی کریں تو آپ پر لپک کر حملہ کرنے کی بجائے وہ چپ چاپ بیٹھے نامعلوم آپس میں کیا کیا سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں، مانو آزاد ہونے کے باوجود جنگل کا یہ شاہی خاندان محبوس ہو۔ سننے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی یہ شیر اچانک بھڑک اٹھتے ہیں، سچ مچ کے جنگلی شیروں کی مانند، اور پھر گیم وارڈن انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھ کر ان کی وہ مرمت کرتے ہیں کہ آخر انہیں لاچار، حاجت مند انسانوں کی طرح بھولے ہوئے سب اشارے خودبخود یاد آ جاتے ہیں۔

یہ سٹی گارڈن ہے۔ یہاں کل دنیا کے درخت اگائے گئے تھے جو کالی زمین کی حیات پرور نمی چوس چوس کر اب کتنے بڑھ گئے ہیں، اس شہر میں جمع شدہ کئی لاکھ بدیسی افراد کی مانند! اس باغ کے ایک علیحدہ کونے میں مقامی نسل کا یہ ایک بوڑھا درخت ہے ننگا، سوکھا اور نحیف۔ یہ بوڑھا درخت سارا دن ایک پاؤں پر کھڑا کچھ سوچتا رہتا ہے اور رات کو ٹھیک بارہ بجے یہاں سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آنے لگتی ہے

کالے لوگوں میں ایک روایت مشہور ہے کہ یہاں ایک نوجوان حبشی کا بھوت روتا ہے۔ اس حبشی نے یہاں خودکشی کی تھی۔ ایک دفعہ میرے ایک خوشحال انگریز دوست کی خوبصورت، نوعمر بیوی نے یہ روایت سن کر اپنی شریر سی نظر اپنے شوہر کے چہرے پر جمالی جیسے اس سے پوچھ رہی ہو "یہ نوجوان حبشی کوئی مایوس عاشق ہو گا؟ جمی، بتاؤ اگر میں بھی تم سے شادی نہ کرتی تو کیا تم بھی ایسے ہی کسی بوڑھے درخت کے نیچے خودکشی کر لیتے، ہاؤ ونڈرفل جمی!" اور پھر جیسے اس

درخت پر ٹکٹکی باندھے کوئی خاموش محبت بھرا نغمہ سنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

اس خوبصورت لڑکی کا یہ طلسم توڑتے ہوئے مجھے بڑی ذہنی اذیت محسوس ہوئی۔

"مادام، مجھے افسوس ہے کہ اس روایت میں محبت کا ذکر بالکل نہیں آتا یہ تو ایک سپاٹ سی کہانی ہے۔ یہ افریقی نوجوان دراصل پاگل تھا لیکن پاگلوں کو بھی اسی طرح بھوک لگتی ہے جیسے ہم سب کو، اس لئے ایک دن یہ پاگل حبشی بھوک سے بیتاب ہو کر کسی بیمار کتے کا کچا گوشت کھا گیا اور پھر پیٹ کے درد سے مزید پاگل ہو کر اس نے یہاں خودکشی کرلی۔

لیکن میں تو آپ کو نیروبی کے قابل دید مقامات کی تصاویر دکھا رہا تھا۔ یہ دیکھئے یہاں سے اس شہر کا سب سے بڑا بازار شروع ہوتا ہے یہاں ایشیائی دوکانداروں کی چکنی چپڑی باتیں سن سن کر گاہک کے دماغ میں پھسلن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف اسی بازار کے آس پاس چار نہایت عالیشان سینما گھر ہیں۔ اس چوک کے بائیں کونے پر اسماعیلیوں کا یہ جماعت خانہ دیکھئے، جماعت خانہ کی عمارت پر بجلی کی ہزارہا بتیاں جل رہی ہیں۔ ان بتیوں کی بے انتہا روشنی میں اکثر افریقی اپنی زندگی کا گھور اندھیرا دیکھ لیتے ہیں، اور پھر ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ نیچے آگرتے ہیں۔

یہ قانون ساز اسمبلی کی عمارت ہے۔ اس نئی عمارت کو بنے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ اس جلیل القدر عمارت کے ٹاور کلاک سے متعلق لوکل

اخبارات میں کئی دن بڑی گرماگرم بحث چلتی رہی۔ ایک گروپ کا خیال تھا کہ ہر گھنٹے کے بعد کلاک سے ٹن ٹن کی آواز آنی چاہیئے اور دوسرے گروپ کے افراد کہتے تھے کہ اس ٹن ٹن سے ان کے سکون میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ آپ بھی اس امر پر ذرا توجہ فرمایئے۔ ہمیں تو دوسرے گروپ کی بات زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے جب رواں دواں زمانے کی ٹن ٹن کا پے پایاں شور شن کر ذہن اپنا توازن کھو بیٹھے تو معمولی سا مزید خلل بھی حالات نازک بنانے کا باعث بن سکتا ہے۔

شہر کی سٹی کونسل نہایت مستعد ہے۔ چند سال ہی میں ممبران کی انتھک جدوجہد نے شہر کا حلیہ بدل دیا ہے۔ نہایت صاف ستھری سڑکوں اور گلیوں کا پلاننگ دیکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا ہے گویا کوئی جدید مغربی شہر اٹھا کر یہاں متمکن کیا گیا ہو۔ لنچ ٹائم پر پرنسس الزبتھ ہائی وے پر سڑکوں میں پھیلی ہوئی نئی نئی موٹر گاڑیوں کی قطاریں دیکھ دیکھ کر تماشائی کا سر چکرانے لگتا ہے۔ شہر میں گھوڑا گاڑیوں کا استعمال عرصہ سے یکسر ممنوع ہے کیونکہ جانور صاف سڑکوں کو گندہ کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سٹی کونسل کی بسیار کوشش کے باوجود شہر کا وہ حصہ ہمیشہ گندہ رہتا ہے جہاں چند انسانوں کا رہنا سہنا جانوروں کی مانند ہے۔ اگر اس علاقہ میں اتفاقاً کوئی موٹر گاڑی گذر جائے تو نیم برہنہ غلیظ افریقی بچے جگہ جگہ ٹولیاں بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، گرد پھانکتے ہوئے تالیاں بجا بجا کر خوب شور مچاتے ہیں اور دور تک گاڑی کی پشت پر کیچڑ آمیز نگاہیں جمائے رکھتے ہیں۔

شہر کے افریقی لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جا رہا۔ لاکھوں پاؤنڈ کے ایجوکیشن پروجیکٹ بنائے جا رہے ہیں ہسپتال

ہیں ان کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ان کی روحوں کو منور کرنے کے لئے مختلف مذہبی مشنوں کو گراں بہا سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔ افریقی ہوزنگ اسکیم کے لئے بے شمار دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے لیکن اس کار عظیم کے باوجود کئی احسان فراموش لوگ بیہودہ باتیں کرتے پھرتے ہیں، نیک نیت لوگوں پر کیچڑ اچھالتے پھرتے ہیں، اپنی اکڑ میں کسی کو شمار میں ہی نہیں لاتے۔

"ہم پر یہ پابندیاں کیوں لگائی گئی ہیں؟"

کوئی پوچھے کہ ان بے ضرر پابندیوں کے بغیر وہ معیاری شہریت کی تربیت کیوں کر حاصل کریں گے۔

"ہمیں ہر جگہ آزادانہ گھومنے پھرنے کی آزادی ہونی چاہیئے" دیکھیئے نا شہروں میں رہتے ہوئے بھی یہ لوگ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہنوز جنگلوں میں مقیم ہیں بے چارے متمدن زندگی کے رموز ابھی تک نہیں سمجھ پائے۔

"ہم اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں"

پاگل! نرے پاگل! ابھی تک مڑ مڑ کر غاروں کو دیکھ رہے ہیں۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے اس خوبصورت شہر کا ماحول بڑا پرسکون تھا۔ یورپی افسر نہایت مہربان تھے، ایشیائی کلرک اور تاجر سرکار کے نام کی مالا جپتے تھے، افریقی نوکر دو چار شلنگ ماہوار تنخواہ اور بچے کھچے کھانے پر ہنسی

خوشی راضی ہو جاتے۔ سب قومیں کا آپس میں بڑا پیار تھا، سب بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ مگر ان چند سال ہی میں زمانہ بڑا پلٹ گیا ہے۔ چار سو بے اطمینانی اور شک کار فرما نظر آتے ہیں، جیسے سب کو کچھ ہو جانے کا خوف ہو، کچھ نہ ہونے کا خوف ہو، جیسے سب پاگل ہونے سے بیشتر حواس کے آخری کناروں پر ہمہ تن گوش کھڑے ہوں، اپنی چیخوں کی آواز سننے کے منتظر!

◎ تیسرے پاگل خانے کے اندر یہ مرکزی نقطہ ہے ایک اور پاگل خانہ، نیرُوبی کی ایتھارو ڈپر انتھارو مینٹل ہاسپٹل۔ دراصل ہماری کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اس پاگل خانے میں چھ ماہ سے ایک بڑا خطرناک پاگل زیرِ علاج ہے۔ جس کو ایک بند وارڈ میں بڑی مضبوط سلاخوں کے پیچھے تنہا رکھا گیا ہے۔ جہاں سے وہ ہر وقت باہر کی دنیا دیکھتا رہتا ہے۔ دو آتش بار خونخوار آنکھیں جو اپنے آس پاس کی ساری دنیا جلتے، تباہ ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں! اور پھر جیسے وہ ذہنی طور پر ساری دنیا کی تخریب کا نظارہ کرنے لگتا ہے، زور زور سے بے اختیار قہقہے لگاتا ہے، سلاخوں کو توڑ کر باہر آ جانے کے لئے دانت پیستا ہے اور سر کے بل الٹا کھڑا ہو کر کسی جہنمی روح کی طرح پیشین گوئی کرتا ہے کہ ایتھارو پاگل خانہ شام سے پہلے پہلے زمین میں میلوں نیچے دھنس جائے گا۔

سب پاگل اس کی آواز سنتے ہی یوں تعظیم سے کھڑے ہو جاتے ہیں گویا ان کا روحانی پیشوا ان سے مخاطب ہو۔ ذرا آپ اس کی خوفناک شکل کا جائزہ لیں، بالکل

کسی مردم خور جانور کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔ پاگل خانے کا سارا عملہ اس سے بچ بچ کر رہتا ہے۔ اگر ان کا بس چلے تو اسے وارڈ کی سلاخوں سے باندھ کر گولی سے اڑا دیں۔ یہ بات نہیں کہ پاگل خانے کے منتظمین فرض شناس نہیں۔ پاگلوں کی خدمت کر کے انہیں روحانی تسکین ہوتی ہے، مگر مجریا کا معاملہ ہی کچھ اور ہے، دو ماہ ہوئے ظالم نے نہایت بے رحمی سے ایک نیک خاتون کا خون ناحق کر دیا۔

پاگل ہونے سے پہلے مجریا نیروبی جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔ ایک دن جیل سے بھاگ نکلا مگر قانون سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے آخر پکڑا گیا۔ اس مجرمانہ فعل کے بعد اس کی سزا بڑھا دی گئی۔

ایک روز وہ جیل سے باہر جانے والی نئی پکی سڑک کے لئے پتھر کوٹ رہا تھا، چپ چاپ، جانے کیا سوچتے ہوئے۔ اسی دوران میں اس کا دماغ چل نکلا۔ جیل وارڈن کے کوڑوں سے اس کی چمڑی ادھڑتی گئی، مگر وہ اپنے گاؤں کے پیڑ گنتا رہا، اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہا، اپنی بکریوں کے رٹے ہوئے نام زور زور سے پکارتا رہا آخر جب زدوکوب سے تھک ہار کر جیل کے کارکنان کو یقین ہو گیا کہ قیدی نمبر ۱۵ پاگل ہو گیا ہے تو انہوں نے اسے اٹھا کر مینٹل ہاسپٹل کی بند لاری میں دھکا دیتے ہوئے ہنس کر کہا "جاؤ ہم تمہیں تمہاری دانا واٹنے کے پاس بھیج رہے ہیں" پاگل خانے کا ڈاکٹر دو چار روز کی تشخیص کے بعد اس واضح نتیجے پر پہنچا کہ قیدی کا پاگل پن خطرناک نوعیت کا ہے۔

چار ماہ بغیر کسی حادثے کے گذر گئے۔ ہسپتال کی میٹرن مسز ہوم مجریا سے نہایت شفقت سے پیش آئی، وہ بڑے فخر سے ڈاکٹر سے کہا کرتی۔

"دیکھ لینا ڈاکٹر، تمہارے علاج سے زیادہ میرا پیار اس بدقسمت قیدی کا دماغ ٹھیک کرے گا۔"

"کوشش کر دیکھو مسز ہوم، مگر یاد رکھنا، ایسے پاگلوں کو اگر زیادہ توجہ دی جائے تو کئی بار ان کا پاگل پن بہت بڑھ جاتا ہے۔"

مسز ہوم مچریا کا بہت خیال رکھتی کچھ اس لیئے کہ وہ مچریا کو اپنے پیشہ ورانہ کمال کا تجربہ سمجھنے لگی۔ اور کچھ اس لیئے کہ اس کا دل تھا ہی دودھ سے لبالب بھرا ہوا ایک کٹورا۔ اسے کالے لوگوں سے بڑی ہمدردی تھی، اکثر اپنی اس ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے وہ رومال نکال کر اپنی خوبصورت سبز آنکھیں پونچھنے لگتی، پور مسز ہوم!

مسز ہوم نے مچریا کے لیئے نہایت عمدہ کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے چکولے کے علاوہ کبھی کبھی وہ انگریزی میس سے اس کے لیئے انڈے ٹوسٹ، مکھن یا مچھلی وغیرہ بھی مہیا کر دیتی، جنہیں نہایت انہماک سے جلدی جلدی چٹ کر کے مچریا سلاخوں سے باہر کھڑی مسکراتی ہوئی مسز ہوم کی طرف اس طرح دیکھتا جیسے اسے بھی ہڑپ کر جانا چاہتا ہو۔ مسز ہوم کی مسکراہٹیں کسی انجانے خوف سے جھرجھری سی محسوس کرنے لگتیں اور جیسے اچانک کوئی کام یاد آ جانے پر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے آفس کو ہو لیتی۔

"ہہ ہہ ہا ہہ ہا!!" دیوانہ گویا اس کا خوف سونگھ کر دیوانہ وار قہقہے لگانے لگتا۔

ایک دھندلی شام کو مچریا نے حسب عادت سلاخوں کے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری تو وہ کھل گیا۔ وارڈن تالا لگانا بھول گیا تھا۔ پاگل مچریا

کسی ہوشمند انسان کی طرح نہایت احتیاط سے پنجوں کے بل چلتے ہوئے باہر آگیا۔ نظر بچا بچا کر بیرونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ کاریڈار کے ایک تنہا کونے میں اچانک، کوئی چمکیلی شئے دیکھ کر رک گیا۔ مالی کی درانتی! دیوانے کے ماؤف ذہن میں ایک خوفناک خیال پرورش پانے لگا مانو درانتی اپنے آپ کو کسی بے گناہ کے خون سے آلودہ دیکھ کر خوف سے دوہری ہو گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مچھریا کی لاکھ منت سماجت کی، مگر پاگل نے ایک نہ سُنی۔

جب مچھریا نے درانتی کو اپنی مضبوط گرفت میں لیا تو کچھ فاصلے پر اُسے مسز ہوم کی پشت دکھائی دی جو غالباً کسی پاگل کو انجیکشن لگا کر بڑے مسرور انداز میں کچھ گنگناتے ہوئے اپنے دفتر کی طرف جا رہی تھی، سارے دن کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اب وہ اپنے گھر جائے گی۔ منہ ہاتھ دھو کر ڈھیلے ڈھیلے صاف گھریلو کپڑے پہنے گی، پھر اپنے شوہر کے پہلو میں آرام کرسی میں لیٹ جائے گی اور اپنے بچوں سے ان کے سکول کی چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری باتیں پوچھے گی۔

"دھپ!!" درانتی کے تیز تیز دانت مسز ہوم کا بایاں کندھا گھاس کی طرح کاٹتے ہوئے اس کے دل میں اُتر گئے۔ جہاں مسز ہوم کے چھوٹے چھوٹے بچے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے اچھل کود رہے تھے۔ ایک دلخراش چیخ! گویا پورے مسز ہوم کی جگہ خود درانتی چیخ اٹھی ہو!!

وحشیوں کی اولاد! پاگل!! مگر مچھریا کوئی جھوٹ موٹ کا پاگل تو تھا نہیں۔ وہ تو واقعی پاگل تھا، اپنے محسن کی پہچان سے قاصر، بالکل پاگل!!

جب اسے ٹھوکریں مار مار کر وارڈنوں نے دوبارہ سلاخوں کے پیچھے پھینکا تو اوندھے منہ گرتے ہوئے اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں مچھریا اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے چاروں طرف پھیلے ہوئے گھنے جنگلات میں جانے پہچانے ہوئے راستوں پر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے، آزاد!!

میں کار میں بیٹھا اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا جو نزدیک ہی کسی دکان میں شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔

"جامبو، بابو!"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا گاڑی کے دروازے پر ایک بڑا خوش پوش افریقی کھڑا تھا۔

"جامبو" جیسے میں نے اُسے بڑے کڑوے انداز میں پوچھا ہو کہو، کیا چاہتے ہو؟"

"یہ گاڑی ایک گیلن پٹرول میں کتنے میل کر لیتی ہے؟" اُس نے مجھ سے افریقی زبان میں پوچھا۔

"چھتیس۔ کیوں؟" دراصل میں کہنا چاہتا تھا کہ اگر چھتیس کی بجائے بیس بھی کرے تو تمہیں اس سے کیا غرض۔

"مجھے یہ فیاٹ بہت پسند ہے۔ تمہاری ہے؟"

"اور کیا تمہاری ہے؟" میں نے دل ہی دل میں کہا اور خفگی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔۔

"اچھی ہے" اُس نے کار کے ارد گرد ایک چکر کاٹ کر کہا "بہت اچھی ہے۔"

میں سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"بیچو گے؟"

میں اپنی سیٹ پر ذرا اچھل کر رہ گیا اور مشکوک نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے" میں نے ڈرتے ہوئے سوچا اور اپنے آس پاس کسی کانسٹیبل کو دیکھنے لگا۔ "ابھی گھڑی بھر میں گاڑی کے ٹرائیل کے لئے پوچھے گا اور پھر اسے لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو جائے گا؟"

اسی اثنا میں اس نے کوئی قیمتی سا سگریٹ سلگایا اور مجھے بھی پیش کیا۔

"نہیں، میں صرف اپنی برانڈ ہی پیتا ہوں۔"

"بیچو گے؟ چھ ہزار دوں گا۔" ٹرائیل کے لئے گاڑی مانگنے کی بجائے اُس نے فوراً اپنی آفر کہہ سنائی۔

چھ ہزار! پچھلے ماہ جب میں یہی گاڑی فروخت کرنے کے لئے اے، بی، سی موٹرز والوں سے ملا تھا تو انہوں نے ساڑھے چار ہزار شلنگ سے ایک سینٹ بھی نہ بڑھایا تھا۔

"شاید یہ آدمی واقعی شریف ہو۔" میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا "آخر شریف اور امیر لوگ سب قوموں میں ہوتے ہیں۔"

"مچاکوس میں میری پچری ہے۔ میرے دو ٹرک ہیں، ایک بڑی سیلون کار ہے۔ مگر مجھے تمہاری یہ چھوٹی فیاٹ پسند ہے۔"

میرا شبہ دور ہونے لگا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے آج شام کو مچاکوس پہنچنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک چھوٹی گاڑی ساتھ ہی لیتا جاؤں۔"

اب میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اسے بڑے تپاک سے گاڑی کے اندر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"ڈھائی سال کے عرصہ میں مجھے اس گاڑی نے ایک بار بھی تنگ نہیں کیا۔ بڑا ساونڈ انجن ہے۔"

"میں آج اے بی سی موٹرز کے شوروم میں گیا تھا، وہاں مجھے اپنی پسند کی کوئی گاڑی ملی نہیں۔"

اب تک مجھے پوری تشفی ہو چکی تھی کہ وہ کوئی اچکا نہیں ہے، اور واقعی میری گاڑی خریدنا چاہتا ہے۔ چھ ہزار شلنگ! میں نے سوچا کہ اگر اسامی پھنس جائے تو بیٹھے بٹھائے پورے ڈیڑھ ہزار کا فائدہ ہو جائے۔ اُسے ذرا پکا کرنے کے لئے میں گویا ہوا "میں یہ کار بیچ کر کوئی بڑی کار خریدنا چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ کوئی معقول گاڑی ملتے ملتے دس بارہ روز لگ جاتے ہیں اور میرا اس کے بغیر ایک لمحہ گزارنا بھی مدت ہے اور پھر ———"

"بابو! تم تو نیروبی میں رہتے ہو۔ روز یہاں طرح طرح کی گاڑیاں آتی ہی رہتی ہیں۔"

میں نے کچھ ایسی شکل بنالی جیسے اپنی گاڑی فروخت کرنے میں کوئی خاص دلچسپی
نہیں رکھتا۔

"اگر تم مان جاؤ بابو، تو میں ساڑھے چھ ہزار دینے کو بھی تیار ہوں - کہو
منظور ہے؟"

"منظور ہے!" میں نے اپنے دل میں یہ آواز بلند کہا اور پھر گویا میرا ہیجان ایک
لمحے کے لئے عریاں ہوکر پھر بناوٹی بے اعتنائی کے پس پردہ جا چھپا۔

"ہونہہ ——"

تھوڑی دیر میں میری بیوی لوٹ آئی - میں نے بڑی بے صبری سے اسے سارا
ماجرا کہہ سنایا - چونکہ افریقی ہماری زبان نہ سمجھتا تھا اس لئے اس کی موجودگی میں بھی
ہم دونوں آپس میں کھلی بات چیت کر سکتے تھے۔

سارا قصہ سُن کر میری بیوی کی آنکھیں کھلنے لگیں۔ بھلا اس میں سوچنے کا معاملہ ہی
کیا ہے؟ جلدی جلدی سودا پکا کرکے رقم وصول کیجئے"۔ مگر چونکہ وہ دوسرے ایشیائیوں
کی طرح بھولے بھالے افریقیوں کی جہالت کا ناجائز فائدہ اٹھانا گناہ سمجھتی تھی اس لئے
مجھ سے بات کرتے ہوئے اس نے گویا اپنے ضمیر کو سمجھایا "اگر آپ سے بیچارے
کا سودا ہو جائے تو بہتر ہے - ورنہ دکاندار تو ایسے بدھو گاہک کو لوٹ کھاتے ہیں"۔

"لیکن اس گاڑی کا ساڑھے چھ ہزار لینا بھی تو لوٹ کھسوٹ ہی ہے"۔ میرا
ضمیر تو اکثر سویا رہتا تھا، لہذا میں نے اپنی بیوی کے ضمیر کو سامنے کھڑا کرکے اسی کا
سہارا لیا "اس ٹوٹی پھوٹی گاڑی کی اتنی قیمت ہمیں کہاں سے مل سکتی ہے، ہر روز کوئی
نہ کوئی کل بگڑی رہتی ہے"۔

"آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔ ساڑھے چھ ہزار میں اُسے اس سے اچھی گاڑی کہاں سے ملے گی؟" میری بیوی کا مضمحل ضمیر بھی کچھ کہے سنے بغیر ایک طرف کھسک کر میرے خوابیدہ ضمیر کے ساتھ جا لیٹا۔

"ہاں" میں سوچنے لگا "اے بی سی موٹرز والے تو سالے لٹیرے ہیں، اتنی اچھی گاڑی ہے، فرسٹ کلاس روڈ ہولڈنگ ہے، پھر بھی قیمت ساڑھے چار ہزار بتاتے تھے۔"

"دیکھو بھیا!" میں افریقی سے مخاطب ہوا "میں ابھی اپنی گاڑی بیچنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری خاطر مان جاتا ہوں۔"

افریقی نے بڑے خلوص سے میرا شکریہ ادا کیا، مانو اس کی پیشکش قبول کر کے میں نے اُس پر بہت احسان کیا ہے۔

"مگر دیکھو، قیمت چکانے سے پہلے تم گاڑی کسی مکینک سے ٹیسٹ کرا لو۔ یا کم از کم خود ہی آزمائش کر لو۔ کوئی سودا کرنے سے پہلے پوری تسلی کر لی جائے تو اچھا رہتا ہے۔"

افریقی سیدھے سادے انداز میں ہنسنے لگا "میں خود مکینک رہ چکا ہوں، کسی کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم لوگ گاڑی دیکھتے ہی اس کی صحیح قیمت پہچان جاتے ہیں۔"

"پھر بھی تمہیں متنبہ کرنا میرا فرض ہے۔" میں نے بڑا خوش ہو کر کہا۔ دراصل ہم ایسے فرائض بڑی مسرت سے نبھاتے ہیں جن کی ادائیگی میں ہماری ذاتی بہبودی کا امکان ہو۔ ایسا کر کے ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہم واقعی بہت فرض

شناس ہیں۔

"اچھا، بابو، تم اگر کہتے ہو تو میں چلا کر دیکھ لیتا ہوں"

ڈرائیور کی سیٹ سے اٹھ کر پہلو میں بیٹھتے ہوئے مجھے یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس ٹرائیل کے بعد بنی بنائی بات بگڑ نہ جائے۔

"آدھے پیسے میرے پاس ہیں لیکن آدھے تھوڑی دور ایک ہوٹل میں رکھے ہوئے ہیں۔ چلو راستے میں یہ رقم وہاں سے اٹھا لیں گے۔" اُس نے واقعی کسی مکینک کی طرح بہت اعتماد سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے" پچھلی سیٹ سے گویا میری بیوی نے کہا ہو کہ آدمی تو بے وقوف معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی ذرا دھیان رکھنے گا۔ کہیں گاڑی کو ایسی ویسی جگہ لے گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" یعنی اگر وہ خلاف توقع بیوقوف نہ نکلا تو ہماری عقلمندی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

"ہونھ" میں نے سگریٹ سلگا کر بڑا دانشمند نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم تو بہت اچھی گاڑی چلا لیتے ہو۔"

اپنی آواز میں چکنا پن محسوس کر کے مجھے اپنا گردسریاد آنے لگا جو دس سینٹ تو اپنی چیز کے وصول کرتا اور دس سینٹ گاہک کی تعریف کرنے کے۔

افریقی خوشی سے پھولا پھولا نظر آنے لگا۔

"میرا نام آروند ہے۔ تمہارا کیا نام ہے؟" افریقی زبان بولتے ہوئے میں نے اپنے افریقی ہاؤس بوائے کے لہجے کی نقل اتارنی چاہی۔

"جیپ۔ میرے پاس ایک۔ جیپ تھی جسے میں بہت تیز چلایا کرتا تھا۔ یاروں

نے یہی نام رکھ دیا۔"

سپیڈو میٹر کی طرف دیکھ کر میں ہنستے ہنستے اچانک ٹھہر گیا "تم گاڑی بہت تیز چلا رہے ہو، اگر کسی کاپ نے دیکھ لیا تو چالان کر دے گا۔"

"یہ مُوا تو کالوں کی لوکیشن میں چلا آیا ہے۔" میری بیوی شاید ڈرنے لگی تھی۔ "میں نے سونے کی دس چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں اور ایک ہار ہے کہیں کوئی گڑبڑ نہ کرنا چاہتا ہو۔"

خوف تو مجھے بھی محسوس ہونے لگا لیکن میں نے بڑی لاپرواہی کا بہروپ بدل کر کہا "کیوں بھائی جیپو، تمہارا ہوٹل ابھی کتنی دور ہے؟"

"بس اب قریب ہی ہے۔" اُس نے کار ایک گلی کی جانب موڑلی جہاں چاروں طرف کالے ہی کالے نظر آ رہے تھے۔

میں کہتی ہوں وہاں میں ضرور کچھ کالا ہے۔ ذرا ہوشیار رہیں،"

میں اپنی سیٹ پر اکڑ کر بیٹھ گیا اور مستعد آواز میں جیپو کو مرعوب کرنے کے لئے کہا "اگر ہم اپنے کام سے جلد فارغ ہو جائیں تو بہتر ہے۔ مجھے ابھی اپنے پستول کا لائسنس لینے جانا ہے۔" پستول کہتے ہوئے میرا لہجہ مضحکہ خیز حد تک ڈرامائی ہو گیا۔

"ہاں، ہاں، بس اب تھوڑا ہی فاصلہ باقی ہے۔"

کچھ دیر میں جب اس نے گاڑی کا رُخ ایک اور ٹیڑھی میڑھی گلی کی طرف کیا تو میں نے اپنی ڈھارس کے لئے بیوی سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ آدمی برا نہیں معلوم ہوتا۔"
"آپ خود تو ہیں ہی نرے بھولے رام، لیکن اپنے ساتھ مجھے بھی بدھو بنا دیا

اب: دیکھئے نا، کوئی گڑبڑ ہوگئی تو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟" لیکن میں نے سوچا کہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

"اب آپ کو کون سمجھائے بات شروع کرنے سے پہلے ہی آپ کو سب کچھ سوچ لینا چاہئے تھا۔ کوئی ہزار احمق ہو مگر ساڑھے چار ہزار کی چیز کے ساڑھے چھ ہزار نہیں دیتا۔"

"پھر یہ سب کچھ پہلے کیوں نہ سوچا؟"

"پہلے کیا سوچتی؟ ہر بات میں چپ چاپ آپ کے پیچھے لگ جاتی ہوں۔"

اتنے میں جلیبو نے گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے روک لی اور "ابھی آیا" کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں اندر جا گھسا۔

"دیکھئے آپ ڈرائیور کی سیٹ پر آجائیں۔ انجن کو چالو رکھیں اور خوب چوکسا رہیں۔ اگر جلیبو پانچ منٹ میں نہ لوٹا تو ہم واپس چلے جائیں گے۔"

"اچھا"، میں نے اپنی بیوی کی ہدایت کو بغور سن کر کہا۔

ہماری پرانی گاڑی کے بڑھے انجن کی پھٹی ہوئی کھانستی سی آواز ہمارے دلوں کی تیز تیز دھڑکنوں کا مذاق اڑاتی رہی اور ہم گھڑیوں پر اپنی حواس باختہ نگاہیں جمائے کسی عام جاسوسی ناول کے کرداروں کی مانند "کچھ ہو جانے" کے منتظر رہے۔ بیٹھا ہونے کے باوجود کھڑے کھڑے سے! لیکن کچھ بھی نہ ہوا پورے سوا تین منٹ کے بعد جلیبو ایک تھیلی اٹھا کر مسکراتا ہوا ہوٹل کے دروازے پر نمودار ہوا اور بڑے اطمینان سے چل کر میرے ساتھ کی سیٹ پر آ بیٹھا۔

"ٹھیک ہے بابو" اب تم ہی چلاؤ"۔ اس نے تھیلی کے اندر نئے نئے

نوٹوں کی گنھیوں کو ہلا کر کہا "اب گاڑی کا ٹرانسفر فارم کہاں سے لیں گے؟"
"میں تو یونہی ڈر گئی تھی۔ یہ تو بڑا اچھا آدمی ہے"۔ یعنی یہ تو واقعی نرا احمق نکلا۔
میں نے مسکرا کر جیپو سے کہا "تم فکر نہ کرو۔ ٹرانسفر فارم بڑے بازار میں کہیں سے لے لیں گے"۔

جب میں گاڑی موڑنے لگا تو میری بیوی کو ایک اور خطرہ لاحق ہوا "آدمی تو بڑا نیک معلوم ہوتا ہے لیکن کون جانے، ایسا ویسا ہی ہو اور یہ رقم کہیں سے چرا لایا ہو۔ ذرا سوچ لیں"۔

میں سٹپٹا سا گیا۔ "تو پھر اب کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے؟ میں یہ تو نہیں کہتی کہ اب سودا توڑ دیں میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ کوئی ایسا بندوبست کریں کہ گاڑی بیچ کر بعد میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا پڑے"۔

بات واقعی معقول تھی۔

"آپ یوں کریں کہ اسے اڈمی کے پاس لے جائیں اور اسی کے سامنے سب لکھت پڑھت کریں"۔ اڈمی میری بیوی کا بھائی تھا اور بیرسٹر بھی۔

"یہ ٹھیک ہے"

تھوڑے فاصلہ پر ایک ٹرک کے پاس کھڑے کسی افریقی نے جیپو کو دیکھ کر اُسے زور سے پکارا۔

میں نے گاڑی روک لی۔

"ٹرک میں پٹرول ختم ہو گیا ہے" اُس نے جیپو سے کہا۔

"یہ میرا ٹرک ہے۔ پچھلے سال بارہ ہزار میں خریدا تھا"

"مجاکوس میں تمہاری بہت بڑی بوچری ہوگی" میری بیوی سوچ رہی تھی کہ اگر میرا شوہر بھی سول سرونٹ ہونے کی بجائے بوچڑ ہوتا تو کتنا دولتمند ہوتا!

"نوکری میں دھرا ہی کیا ہے جی" پھر اس نے اپنی زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ "ہم بھی اگر سرکاری ملازمت میں سر کھپانے کی بجائے کوئی اپنا دھندا شروع کرتے تو آج ہزاروں لاکھوں میں کھیلتے"۔

"ہاں بھئی، ٹھیک کہتی ہو۔ سمندر پار آ کر بھی اگر جھک ہی مارنی تھی تو اس سے یہی اچھا تھا کہ اپنے ہی دیش میں کہیں پڑے رہتے"۔ مجھے سچ مچ بڑا افسوس ہونے لگا۔

"تمہیں کئی بار کہا ہے کہ گھر سے پٹرول وغیرہ دیکھ کر چلا کرو"۔ جیپو نے اپنے ٹرک کے ڈرائیور سے کہا۔ "بابو!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر تمہارے پاس بیس پچیس شلنگ ہوں تو اسے دیدو۔ میرے پاس موٹے نوٹ ہیں۔ تمہارے یہ پیسے بھی میں گاڑی کی قیمت کے ساتھ ادا کر دوں گا"۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ بیس شلنگ کا ایک ہی نوٹ موجود تھا۔

"میرے پاس تو صرف بیس ہی ہیں"۔

"پانچ میرے پاس بھی ہیں" میری بیوی نے کہا۔

"سانیٹے" اس نے ۲۵ شلنگ لے کر ڈرائیور کو دیدیے "ان سے کام چل جائے گا"۔

افریقی لوکیشن سے نکل کر جب میں نے اومی کے آفس میں جانے کے لئے کار کو ریور روڈ کی جانب موڑا تو میرے ذہن میں کئی ننھے منے خیالات رائن بعلی

کر رہے تھے "ساڑھے چار ہزار میں کوئی اور پرانی گاڑی خرید لوں گا۔ باقی رہا دو ہزار۔ تین سو میں میرا نیا سوٹ بن جائے گا۔ دو چار سو میں بیوی بچے ٹل جائیں گے اور باقی بنک میں جمع کر دوں گا"۔ بنک بک کے ہندسے میرے ذہن میں داخل ہو کر اک این رول کی تُند دھنوں پر بے اختیار ناچنے لگے۔

"پوں — پیں — پیں!" ایک ڈبل ڈیکر بس سے ٹکرانے سے میں بال بال بچا۔

"میں نے کہا ذرا سنبھل کے چلایئے" میری بیوی نے ہدایت کی۔

"بیٹھے بٹھائے پورے دو ہزار کا فائدہ ہوا ہے"۔ اُس کی بات سے قطعاً بے خبر میں جیسے بول بول کر سوچنے لگا۔

"اچھے ہیں آپ، نرے اچھے۔ لوگ تو چپ چاپ لاکھوں کی کمائی ہضم کر جاتے ہیں اور آپ کو صرف دو ہزار سے ہی پیٹ درد ہونے لگا۔ دیکھئے پھر آپ سڑک کی دائیں طرف آ رہے ہیں۔ سنبھل کر گاڑی چلایئے"۔

"جب ہمیں کوئی دوسری گاڑی مل جائے گی جیپو بھیا، تو ہم تمہاری بوچری دیکھنے مچاکوس آئیں گے۔ تمہارا تو وہاں بہت کاروبار ہو گا"۔

"ہاں بابو! مونگو کی بڑی مہربانی ہے۔ ضرور آنا۔ بیبی جی کو بھی ساتھ لانا ہم تمہیں شکار کھیلنے لے جائیں گے"۔

"یہ لوگ کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں!" میری بیوی نے مجھ سے کہا۔ "ادمی کے دفتر میں کام ختم کر کے آپ ابھی اسے اپنے گھر لے چلیے۔ بیچارہ چائے وائے ہی پی جائے گا"۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بیوی ذہنی طور پر ساڑھے چھ ہزار کے سو سو کے نوٹ گن رہی ہو۔ اُس کے چہرے کے کھردرے خطوط ملائم ملائم نظر آنے لگے

اس نے نہایت شفقت سے کچن افریقی بولتے ہوئے جیپو سے پوچھا۔
"تمہارے کتنے بچے ہیں؟"
"چھ"
"پڑھتے ہوں گے؟" میں نے ٹانگ اڑانی چاہی، لیکن نامعلوم کہاں سے کوئی بھوری بلّی سڑک کے عین درمیان بھاگی چلی آئی۔
"رو ــــ رر ــــ ر!" اسے بچانے کے لئے ادھر اُدھر اسٹیرنگ گھما گھما کر میرا دم پھول گیا۔
"میں نے کہا ذرا سنبھل کے چلایئے نا۔"
"سنبھل کے کیا خاک چلاؤں۔" میں نے اپنی بیوی کو جھلا کر جواب دیا۔ اور پھر سٹی کونسل کو برا بھلا کہنے لگا۔ "دیکھو نا ڈوگی! ہم موٹر والے بیسیوں لائسنس لیتے ہیں مگر ہمیں کتنی پوئر سروس ملتی ہے!"
جیپو نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا قیمتی سگرٹ سلگا کر ایک مجھے بھی پیش کیا۔ اس دفعہ میں نے اپنی خاص برانڈ کا بہانہ کرنے کی بجائے جھٹ شکریہ کہہ کر سگریٹ قبول کر لیا۔
"یہ روڈ دیکھو ذرا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے ہیں مگر ان کی طرف کوئی توجہ ہی دیتا۔ سینکڑوں کتے بلیاں شہر میں آوارہ اچھلتے پھرتے ہیں۔ ان کی روک تھام کرنا کوئی بھی اپنی ذمہ داری میں شمار نہیں کرتا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو بابو!"
"میں نے کہا جی!" میری بیوی سامنے زیورات کی ایک دوکان کا بہت بڑا

بورڈ پڑھ کر کہنے لگی۔ "کوئی دوسری گاڑی لے کر بھی ڈیڑھ دو ہزار تو بچ ہی جائیں گے میرے لئے آٹھ دس چوڑیاں ہی بنوادیں۔"

"دیا لو!" جیپو نے اچانک کچھ یاد آنے کے انداز میں کہا۔ "اگر تمہارے وقت کا ہرج نہ ہو تو یہاں صرف ایک منٹ کے لئے رک جاؤ۔ میرا چچیرا بھائی اس گلی میں رہتا ہے۔ یہ گاڑی دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں؟"

جب جیپو اپنے چچیرے بھائی کو لانے کے لئے گلی میں داخل ہو رہا تھا تو اس کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے میری بیوی نے کہا۔ "بڑا امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"اور کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ سب کالے برے ہی ہوتے ہیں؟" میں ستانے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کر کے میں اپنی بیوی کے کندھوں کو پکڑ کر دبانے لگا۔ وہ ذرا قریب سرک آئی۔ "اے! بھرے بازار میں بیٹھے ہیں، لجا نہیں آتی؟"

پھر وہ مزید قریب سرک آئی۔ "اگر اب کے بھی مجھے چوڑیاں لے کر نہ دیں تو کبھی نہ بولوں گی۔"

"بھئی، تم سے چوڑیاں اچھی ہیں؟ اتنا پیسہ مفت ہاتھ آرہا ہے آج تمہاری چوڑیوں کا ناپ دے کر ہی گھر جاؤں گا۔"

"سچ؟!" لیکن یکایک جیسے اُسے کسی بھڑنے کاٹ کھایا ہو۔ "سنئے!" اس نے کہا "کہیں یہ مُوا دھوکا تو نہیں دے گیا؟"

"ہائیں؟ ہاں!"

میں گاڑی سے نکل کر تھوڑی دُور تک اُس گلی میں آیا مگر وہاں جیپو کا کوئی نشان

نہ تھا دو چار منٹ ادھر اُدھر دیکھ کر لوٹتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جُل دے گیا ہے۔

"کمینہ!"

"کمینہ!"

مانو ہم نے جیپو کو ایک بار کمینہ اس لئے کہا ہو کہ ہمارے پچیس شلنگ اڑا لے گیا اور ایک بار اس لئے کہ ہماری دو ہزار کی رقم خواہ مخواہ ماری گئی۔

جہاز کسی پٹے ہوئے کتے کی مانند ہانپتے چیختے پانی کی سطح پر دوڑ رہا تھا۔

"کل سویرے ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔" شیخ عبداللہ پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ پہلا پیک چپکے سے یہیں کہیں پھینک دوں یا اٹھ کر ڈیک کی نالی تک جاؤں۔

"اور پرسوں بمبئی۔" جیسے پنڈت کرم چند نے کہا ہو۔ "شیخ صاحب، یوگنڈا کی بات اور تھی۔ وہ پرایا دیش ہم دونوں کا تھا۔ اب آپ کی کراچی اور ہماری بمبئی۔"

"آج جہاز بہت ڈول رہا ہے۔" سندر لعل کی سندر دلہن نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"اری دل نہ ڈولے تو جہاز ڈولنے سے کچھ نہیں ہوتا۔" پھر سندر لعل پنڈت کرم چند کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس سے کہنا چاہتا ہو۔ "ادھر میلی نظروں سے نہ دیکھیے پنڈت جی۔ یہ میری دلہن ہے، پرایا دیش نہیں۔"

"آپ ٹھیک بولتے ہو۔" ہیر جی ویلجی اپنے ۵۵۵ کے ڈبے سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ "بات تو تبھی بگڑتی ہے جب دل ڈولنے لگے۔ اگر ہمارے

دل ڈولتے تو ہم گھر بار چھوڑ کر امیریکہ سے اس ترّاں کاہے کو بھاگتے؟ یہ لو بھیا سندر لعل، سگریٹ پیو۔"

"تھینک یو یار" سندر لعل نے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔ "جہاز میں یہ بات بڑے مزے کی ہے کہ روپے کی چیز آٹھ آنے میں مل جاتی ہے۔ سگریٹ کے کتنے ڈبے لئے ہیں؟"

"ایک بالنٹ پورے دو سو سگرٹ لے کر اُتر سکتا ہے۔ میں نے اپنی اورت کے نام کے بھی دو سو سگریٹ رکھ لئے ہیں۔"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے ہیر جی؟ کوئی پوچھے تو کہہ دینا وہ بھی پیتی ہے"

جواباً ہیر جی نے زور سے قہقہہ لگایا، گویا ذہنی طور پر اپنی دھرم کرم کی ناری کو سگریٹ پیتے دیکھ رہا ہو۔

"اونھ۔!" اس کی دھرم کرم کی ناری نے دھوتی ٹھیک کرتے ہوئے سر جھٹک دیا۔

"یہ جہاز بڑا اوور لوڈڈ ہے۔"

"کل رات مجھے یوں لگا" پنڈت کرم چند کہنے لگا "جیسے ہمارا جہاز ساگر کی تہہ کی طرف لڑھک رہا ہو۔ پھر میں غوطے کھاتا ہوا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔"

"ارے پنڈت بابا" ہیر جی گویا ہوا۔ "تم کاہے کو پھکر کرتا ہے جی اب سالا کالا لوگ تو بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

"ہاں پنڈت جی اب ڈر کی کوئی بات نہیں۔ گنگا کے کنارے بیٹھ کر مزے سے رام نام جپئے۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے سندر لعل۔ افریقہ کی کمائی تو کسی بھلے استھان پر ہی ہضم ہو گی۔ بھارت کے بڑے بڑے سیٹھ مورکھ تو نہیں کہ سارے دیش کو مندروں سے لاد دیا ہے۔"

"دیکھو جہاز پھر ڈولنے لگا ہے۔"

"اس بار جہاز پورے دو ہزار مسافر لایا ہے۔" پنڈت کرم چند اپنے آس پاس کیبن کلاس کے ڈیک پر نظریں پھیلا کر گویا مسافروں کی گنتی کرنے لگا۔ "تین چار سو تو ہم کیبن کلاس پیسنجر ہی ہونگے۔"

"ہاں، ویلفیر آفیسر نے کہا تھا کہ تھرڈ کلاس پیسنجر جانوروں کی طرح نچلے ڈیک پر لدے ہوئے ہیں۔"

"تکلیف کے دو ہی روز تو باقی ہیں۔" سندر لعل کی دلہن کے سامنے اپنے فرسٹ کلاس کیبن کا ڈناوپ بیڈ آیا۔ "مل جل کر گزار دیں گے۔" وہ اپنے سندر لعل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگی۔

"شپنگ کمپنی والے بیچارے کیا کریں۔ جب سے آزادی کا قصہ شروع ہوا ہے سب لوگ اپنے اپنے سامان سمیت بھاگ رہے ہیں۔"

"ہاں زیادہ وزن تو سامان ہی کا ہے۔ پورے چودہ گھنٹے صرف لوڈنگ ہی میں صرف ہو گئے۔" شیخ عبداللہ تیز تیز پان چباتا ہوا دل ہی دل میں اپنے سامان کے نگ گننے لگا۔

"ممباسہ پورٹ پر کالے قلیوں نے میری سلائی کی مشین، دھڑام سے ہول میں دے ماری۔"

"ابھی پچھلے تو برس ہی میں یہ مشین میرے باپ نے داج میں دی تھی" سندر لعل کی بیوی ہیر جی کی بیوی سے کہنے لگی۔

"اور کیا کیا دیا تھا؟" ہیر جی کی بیوی نے اپنی کرسی اُس کے پاس ہی سرکالی۔

"حرامی حبشی جان بوجھ کر ہمارا سامان توڑ پھوڑ رہے تھے۔ میں نے تو پورٹ پر ایک انگریز افسر سے شکایت بھی کی تھی مگر ہماری کون سنتا ہے؟"

"انگریزی جہازوں میں کتنی احتیاط سے لوڈنگ کی جاتی ہے!"

"نہیں یار، سالا سامان تھا ہی بہت جیادہ، اگر اِس ماپھک ٹیج ٹیج لوڈنگ نہ ہوتا تو سالا جہاج ڈوب جاتا اور لیٹ ہو جاتا۔"

"آخر یہ لوگ اتنا سامان لائے ہی کیوں ہیں؟"

"سبھی لائے ہیں بابا، تم بھی ادر میں بھی۔ سالا اپنا گھر چھوڑنا بڑا مسکل ہوتا ہے۔"

"یہ بہت منع کرتے رہے" سندر لعل کی بیوی نے ہیر جی کی بیوی کو بتایا۔ "پر میں نے تو گھر کی سوئی سلائی تک پیٹی میں رکھ لی۔"

"میں بھی سب کچھ اٹھا لائی ہوں" ہیر جی کی بیوی نے نہایت مسرور آواز میں جیسے کسی لوٹ کے مال کا ذکر کیا ہو۔ "بس پھر ان کا ایک سوٹ رہ گیا، وہ بھی انھوں نے لونڈری میں دے رکھا تھا۔"

"میں نے سوچا" ہیر جی وضاحت کرنے لگا "سوٹ تو روج بنتے رہیں گے۔ بڑی مسکل سے جہاج کے ٹکٹ لیے ہیں، سالے موکے کا پھائدہ اٹھاؤ۔"

"اپنے راج میں تو یہ لوگ گن گن کر بدلے لیں گے۔"

"جو لوگ وہاں رکے ہوئے ہیں، تنگ آ جائیں گے آخر میں۔"

"ہم بھی تو تنگ آ کر ہی نکلے ہیں۔"

"وہ اپنی سٹریٹ کا رتن سنگھ تھانا شنج صاحب؟"

"ہاں؟"

"وہ ہر روز کام سے لیٹ لوٹتا تھا۔ کئی لوگوں نے سمجھایا مگر جوانی بھلا کس کا کہا سنتی ہے؟ بس جی ایک دن رات کے اندھیرے میں کالوں نے دکان میں ہی آ لیا۔ مار مار کے بے ہوش کر دیا اور ساری دکان لپیٹ کر چلتے بنے۔"

"یہ تو معمولی واقعہ ہے پنڈت جی۔ ہمارے قصبے کے بڑے بازار میں کالے دن دہاڑے ٹرک لئے آن پہنچے، اور مار دھاڑ شروع کر دی جی۔" ایک پارسی نے کہا۔

"پولیس کہاں بیٹھی رہی؟"

"بس جی پولیس کے آنے سے پہلے ہی یہ لوگ سارا بازار سمیٹ کر یہ جا وہ جا۔ میرا آنکھوں دیکھا قصہ ہے جی۔"

"ان ڈاکوؤں کو چھوڑو، میں تمہیں اپنے افریقی نوکر کی بات سناتا ہوں، دیکھنے میں اتنا شریف، اتنا مسکین مگر ——"

"ان لوگوں میں دراصل کوئی شریف ہوتا ہی نہیں۔"

"بات تو سنو، یہ آدمی پندرہ سال میرا نمک کھاتا رہا۔ اب ہمارے دیش میں نوکر اپنے مالک کے لئے جان خطرے میں ڈال لیتا ہے۔ ہندوستان میں میرے دادا کا ایک نوکر تھا ——"

"آپ اپنے افریقی نوکر کی بات سنائیں جی۔" پارسی نے جہاز کی کینٹین کا لیمینڈ چکھتے ہوئے منہ بنا کر اسے نیچے رکھ دیا۔ "بڑا باسی سوڈا ہے۔"

"بات کیا ہونی ہے؟ پندرہ سال میرا نمک کھاتا رہا اور کھانڈ چوری کرتا رہا۔ وہ تو اتفاق سے مجھے پتہ چل گیا ورنہ یہ بھلا مانس تو مجھے ساری زندگی لوٹتا رہتا۔ میرا مارکیٹ میں کھانڈ کا تھوک بیوپار ہے۔ یہ حرامی کئی سال میری کھانڈ چرا چرا کر اپنے گھر میں علیحدہ دھندا چلاتا رہا۔"

"سالا سارا کوم چور ہے۔ میرا سسر ادھر ایک بڑا مالدار آدمی تھا۔ جب میں شادی بنا کے پہلے پہل افریکہ آیا تو وہ کہنے لگا۔ 'دیکھو بیٹا، افریکہ کی دو چیزوں سے بچ کر رہنا، نمبر ایک ادھر کا کالا کوبرا، نمبر دو ادھر کا کالا مانس، دونوں بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔"

"مشکل یہ ہے ہیرجی کہ ان کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں۔"

"ارے تو گجارے کی کیا بات کرتا ہے سندر لعل۔ تو یہی کہنا چاہتا ہے نا کہ گھر کے کام کاج کے لئے کالا بوائے چاہیئے۔ بھارت میں سارا استری جاتی کچن کا کام کھد کرتا ہے۔ پھر ہمارا اورت سالا افریکہ پہنچ کر میم ساب کاہے کو بنتا ہے؟ دے جواب۔"

"جواب کیا دوں؟ اب تو افریقہ چھوڑ کر اپنے دیش ہی لوٹ رہا ہوں۔ سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے ہی کرنا ہوگا۔"

"ہاتھوں سے محنت کر لینا اچھا، سینہ ہر دم خوف سے بھرا رہا تو وہ ہوگا۔"

"ہاں برادر، یہ بھی کیا زندگی ہوئی۔ دروازے لاکھ مقفل رکھو پھر بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کوئی کالا ڈاکو کہیں سے پھدک کر ـــ"

شیخ عبداللہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ کچھ فاصلے پر جہاز کا ایک افریقی نوکر کندھے پر رستے کا رول لٹکائے جھوم جھوم کر ان کی جانب آرہا تھا۔ "ارے یہ کالا یہاں بھی آ ٹپکا۔"

سب نے اپنے چہرے افریقی کی طرف لٹکا لیے۔

"کیربو کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"پر یہ کمپنی تو ہندوستانی ہے، پھر یہاں کالے کا کیا کام؟"

"یہ بھی جہاز میں کسی بندرگاہ میں گھوم آیا ہو گا۔"

"کالے اب پہلے کالے نہیں رہے۔ میرے پاس ایک افریقی کُک تھا جو پانچ سال ایک انگریز فوجی کے ہاں لندن میں مقیم رہا۔"

آج کل کالے آدمی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔" بولنے والا ڈیڑھ دو گز پر آرام کرسی میں لیٹا ہوا تھا۔

افریقی ملاح ان کے مزید قریب آیا تو بڑے شادماں لہجے میں ان سب کو "ہیامبو" کہا۔

"ہمیں سلام کر کے دراصل ہمارا مذاق اُڑا رہا ہے۔" افریقی آگے بڑھ گیا تو شیخ عبداللہ بولا۔

"سارے جہاز میں بھی ایک افریقی ہے مگر چال میں اکڑ دیکھو۔"

"ادھر ہمارے کسی بھائی کو اگر پندرہ افریقیوں میں تنہا سفر کرنا پڑ جائے تو ڈر سے بیچارے کا دم سوکھ جائے۔"

"غریب آدمی کا کام تو صرف بھوک سے ہی سوکھتا ہے۔" آرام کرسی پر لیٹے ہوئے آدمی نے پھر ٹانگ اڑائی۔

ایک سادھو نما موٹا سا مسافر وہیں نزدیک ہی ڈیک پر چلتا چلتا گویا دھکا کھا کر رک گیا۔ "یہ غلط ہے بیٹا۔ بزنس کا دم واسطوں اُس سے سوکھتا ہے جب

اُسے ایشور نام کا امرت پراپت نہیں ہوتا۔"

"آہا۔ ہا۔ ہا!" پنڈت کرم چند سر پر اپنی پگڑی ٹھیک کر کے اُس سادھو کو توصیف آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ "بڑے مہان وچار ہے آپ کے، مہاراج۔ آئیے براجئے۔"

سادھو مہاراج اُس کے پاس ایک آرام کرسی پر چپت ہو گئے۔

"آپ سری گنپت رائے گنیس داس جی ہیں۔" ہیر جی نے سادھو مہاراج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بھارت سے امیریکہ کے دھارمک دورے پر آئے تھے۔"

"بڑا سندر کیرتن کرتے ہیں مہاراج۔" ہیر جی کی بیوی نے سندر لعل کی بیوی کو بتایا۔ "ہمارے سہر میں بھی آئے تھے۔"

"جہاز میں اتنے دن آپ کہاں چھپے بیٹھے تھے مہاراج۔" پنڈت کرم چند نے سری گنپت رائے گنیش داس جی سے کہا۔ "ذرا پہلے مل جاتے تو سارا سفر پربھو کیرتن میں کٹ جاتا۔"

"مہاراج کوئی گیت سنائیے۔" جب سے سندر لعل کی شادی ہوئی تھی، اُسے گانا بجانا بڑا اچھا لگتا تھا۔

"ہاں مہاراج، کیرتن ہو جائے۔" پنڈت کرم چند نے بھی درخواست کی۔

"اچھا بٹیا۔" شری گنپت جی سیدھے جہاز کی بار سے ہی آ رہے تھے، اس لئے اُن کے چہرے پر مہاتماؤں کا سا جلال نمایاں تھا۔ "جاؤ پندرہ نمبر کے کیبن سے ڈھولک اٹھا لاؤ۔"

"کچھ بیئر بھی لے آؤں، مہاراج؟" ہیر جی نے بظاہر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں بیٹیا، سوم رس چکھ کر پربھو بھگت کی خالی آواز شردھا اور پریم سے بھر جاتی ہے۔"

کیرتن شروع ہونے کے چند ساعت بعد ہی وہاں بھگتوں کا ڈھیر جمع ہوگیا۔

رادھے شیام!

جے بھگوان!

جے بھگوان!

رادھے شیام!

ڈھولک گونج رہی تھی، تالیاں بج رہی تھیں، منہ بول رہے تھے۔

رادھے شیام!

جے بھگوان!

سمندر کی لہریں گویا اچھل اچھل کر اوپر آنے کو بے تاب ہوں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" وقت ٹھہرے کا ٹھہرا رہ گیا ہو، جہاز جامد و ساکت سا چل رہا ہو۔

جے بھگوان!

رادھے شیام!

وہ افریقی ملاح بھی کام سے لوٹ کر کیرتن کرنے والوں کی ایک جانب مبہوت سا اُن کے چہرے تکتا رہا، سب بھگتوں کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ بھی ہلنے لگے، جیسے وہ بھی گا گا کر کہنا چاہتا ہو۔

رادھے شیام!

جے بھگوان!

مگر وہ گانہ پایا، وہ تو صرف کام کے راگ سے ہی مانوس تھا۔ اس نے اپنی ساری عمر میں ایک گیت بھی نہ گایا تھا، نہ بھگوان کا، نہ رادھے کا۔ اُس کے ہونٹ تو کام کی شدت کے بعد صرف بھوک اور پیاس سے ہی پھڑکتے تھے تاہم اس وقت اس کے ہونٹ بھی تال کے مطابق ہلتے رہے۔

رادھے شیام!

جے بھگوان!

بھگوان کے نام نے گویا افریقی کے چہرے کی وحشیانہ تندی پر نرم نرم پاؤڈر چپکا دیا ہو۔ وہ بڑا شریف اور بھلا مانس نظر آنے لگا۔

"ارے یہ کالا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

ٹھنڈے میٹھے رس میں کڑواہٹ گھل گئی۔ "ارے یہ کالا——"

اتنی نگاہوں کو اپنی طرف گھورتے پاکر افریقی بے چین سا نظر آنے لگا۔ سُر بے سُر ہونے لگے۔ افریقی کو خیال آیا کہ اس کے کھانے کا ٹائم گزر رہا ہے، اگر وہ یہیں کھڑا رہا تو میس بند ہو جائے گا۔ وہ نہایت تیزی سے پلٹتے ہوئے کسی عورت سے ٹکرا گیا۔

"ہائے!" عورت کو لگا جیسے افریقہ میں کوئی کالا اُس کے کنگن اتارنے کے لئے اس کی جانب جھپٹا ہو۔

"جہازی کا آدمی ہے۔ مُوؤں نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔" ایک اور عورت افریقی کو دیکھ کر بولی۔

"لیجئے مہاراج۔" ہیرجی نے شری گنپت جی سے کہا۔ "بڑے ہونہار ذرا

گیلے کر لیجئے۔ گا گا کر آپ کا دم سوکھ گیا ہو گا۔"

"ہاں بابا، میرا تو بھوک سے بھی دم سوکھ رہا ہے، جاؤ کہیں سے کچھ جلدی لا دو۔"

رادھے شام!

جے بھگوان!

ساری رات کیرتن ہوتا رہا مگر جب پو پھٹنے کو آئی تو سب مسافر کراچی کی باتیں کر رہے تھے۔

شیخ عبداللہ گجردم تیار ہو کر پنڈت کرم چند کے کیبن کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ "ارے او پنڈت جی، آیئے ڈیک پر چلیں، کراچی کی بندرگاہ نظر آ رہی ہے۔"

"اچھا، تو آپ کی کراچی آ ہی گئی آخر۔" پنڈت کرم چند نے دروازہ کھول کر کہا۔

"آپ کی بمبئی بھی آ جائے گی۔ گھبراتے کیوں ہیں؟" شیخ عبداللہ کی آواز فرطِ مسرت سے کانپ رہی تھی۔

"پنڈت جی" ڈیک سے کراچی کی بتیاں دیکھ کر شیخ عبداللہ کے ذہن میں ماضی کی بتیاں ٹمٹمانے لگیں "آج سے تیس برس پیشتر جب میں پہلی بار یہاں سے افریقہ کے لئے روانہ ہوا تو دل ڈوب رہا تھا، ماں اپنوں کو کنارے پر روتا چھوڑ کر میں نے سمندر میں چھلانگ دے ماری ہو۔ پھر اس دوران میں دو تین دفعہ وطن آیا تو ہمیشہ کلیجے پر پتھر رکھ کر افریقہ لوٹا۔"

"بڑی عجیب بات ہے شیخ صاحب کالے پانی کی سزا کو ہم پھانسی سمجھتے ہیں مگر روزی کے لئے جان بوجھ کر بن باس لے بیٹھتے ہیں۔"

"میں پورے تیس برس افریقہ میں رہا، پنڈت جی۔ لیکن ایک دن بھی یوں نہ لگا کہ یہ ملک میرا ہے۔"

"لگے کیسے شیخ جی۔ جہاں ہر دم چوری ڈاکے کا کھٹکا لگا رہے وہاں آدمی خوش کیسے رہ سکتا ہے۔"

"ہمارے کئی ہندوستانی اور پاکستانی بھائی افریقیوں سے بھی زیادہ غریب ہیں مگر کتنے شریف ہوتے ہیں!"

"شرافت تو باپ دادا سے ورثہ میں ملتی ہے۔ جن لوگوں کو اپنے خاندان کا ہی علم نہ ہو وہ شریف خاک ہوں گے؟"

"یہ آپ نے سولہ آنے ٹھیک کہا۔" ایک ادھیڑ عمر آدمی بول اٹھا۔ "میں نے ساری عمر پولیس کی نوکری میں گزاری ہے۔ ان لوگوں سے میرا ہر دم واسطہ رہتا تھا۔ سب لفنگے ہیں۔ بہت سوں کو تو اپنے باپ کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا۔"

"شکر ہے ان لوگوں سے جان چھوٹی۔ اب مزے سے اپنے بھائیوں کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔"

"ہمارے لوگ نرا سونا ہیں پنڈت جی۔"

"جی ہاں، ہمارا اپنا دھرم ہے، ایمان ہے۔ بھگوان سے ڈرنے والا آدمی بے چارہ کیا جرم کرے گا۔"

"وہ دیکھئے، وہاں ہمارا کسٹمز آفس ہے۔ وہ۔"

"آپ کے پاس کوئی ایسی ویسی شے تو نہیں۔"

"چیزیں تو سبھی ہیں پنڈت جی۔ آخر یہاں گھر بنانے کے لئے آئے ہیں۔"

"بس چیکے سے معاملہ طے کرلیں۔ میں تو ہمیشہ کسٹمز پر ہمیشہ یوں ہی کرتا ہوں
بیس پچیس کرٹوے ہو گئے تو کیا، آرام سے کسٹمز ہاؤس کے باہر تو آجاتے ہیں۔"
"شکر کیجئے صاحب۔" ریٹائرڈ پولیس آفیسر اب پاس ہی کسی اور گروپ میں
جا کھڑا ہوا تھا "کہ آپ اپنا سامان لانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے وہاں
ساری عمر پولیس میں گزاری ہے اور ——"
"اٹھارہ۔ انیس۔ بیس۔" شیخ عبداللہ نے دل ہی دل میں اپنے سامان
کے نگ گننے کے بعد پنڈت کرم چند سے کہا۔ "پنڈت جی، اتنا سامان لیکر
گھر سے نکلا تھا تو سوچتا تھا کہ کالے اسے جہاز پر پہنچنے سے پہلے پہلے ہی اڑا
لے جائیں گے۔ ایک ایک شے جان سے لگا کر لایا ہوں۔"
"شکر ہے بنسری والے کا، شیخ صاحب۔ اب کسی بات کا ڈر نہیں۔"
"ہاں جی، اب کس بات کا ڈر ہے۔ اپنے گھر تو آہی پہنچے ہیں۔"
تھوڑی دیر میں سب لوگ تیار ہو کر ادھر اُدھر گھومتے پھرتے نظر آنے
لگے۔ کئی جہاز کے کناروں پر کھڑے دور بندرگاہ پر جمع شدہ ہجوم پر نگاہیں
جمائے ہوئے تھے۔ کراچی اترنے والے مسافر بے چین تھے کہ جلدی جلدی
ڈاکٹری اور امیگریشن سے فارغ ہو جائیں۔ آخر دو پائیلاٹ آئے اور جہاز کو
بندرگاہ کی جانب کھینچ لائے۔ نکلتے سورج نے گویا مسافروں سے کہنا چاہا۔
"ارے میں وہی ہوں جو افریقہ میں تھا۔ میں ساری دنیا میں وہی ہوتا ہوں۔"
مگر کسی نے اس کی صدا پر کان نہ دھرے۔
یہ صبح، یہ کراچی، مادرِ وطن، اپنے لوگ ——!

"وہ دیکھو تمہارے ماموں!" جہاز میں کھڑی ماں نے اپنے بچے کو اٹھا کر نیچے دھرتی پر اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ میرا بھائی! بھائی جان!"

"میرا یار! اوئے بدرے!!"

اوپر جہاز پر اور نیچے بندرگاہ پر ایک غوغا سا بپا ہو گیا۔ جہاز کا وہ افریقی ملاح بھی اب کہیں نظر نہ آتا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں جا چھپا تھا۔

"ابّی" شیخ عبداللہ کا معصوم لڑکا اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر ضد کر رہا تھا۔ "میں اپنے گھر جاؤں گا۔"

"ارے بھئی، اپنے گھر ہی تو آئے ہیں۔"

"ناہیں ابّی۔ میں بیٹو کے گھر جاؤں گا۔"

"بیٹو ہمارا افریقی نوکر تھا۔" شیخ عبداللہ نے پنڈت کرم چند سے کہا۔

"ناہیں ابّی، مجھے بیٹو کے پاس لے چلو۔" شیخ کا بیٹا رونے لگا۔

"بچہ ہے۔ ذرا پچکار کر چپ کرا دیجیے۔"

"پنڈت جی" شیخ عبداللہ نے اپنی عینک میں سے زور لگا لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میرا بھائی مجھے لینے نہیں آیا۔ اِن لوگوں میں کوئی ہمارا پہچان والا نظر نہیں آتا۔"

"میرے لئے تو سب بیگانے ہیں شیخ صاحب۔ اپنی بمبئی کی بندرگاہ پر شاید کوئی پہچان والا مل جائے۔"

"دیکھیے نا، آدمیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، پر اپنا بھائی کہیں نظر نہیں آتا۔"

"بھائی نہ سہی، بھائی کی طرح تو ہیں"۔ پنڈت کرم چند شاید اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے پچھلے کئی برس سے اُسے ایک خط بھی نہ لکھا تھا "اور سچ پوچھیں شیخ صاحب، تو آج کل کے بھائیوں سے پرائے اچھے رہتے ہیں"۔

جہاز نے دوسرے روز بمبئی کو روانہ ہوتا تھا۔ پنڈت کرم چند پرسر کی اجازت لے کر شیخ عبداللہ کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا کہ چند گھنٹوں میں کراچی کی سیر کر کے لوٹ آئے گا۔

"چلئے شیخ صاحب، آپ کی کراچی دیکھ آتے ہیں"۔

"آپ بھی کیا یاد کریں گے پنڈت جی، یہ دلہن تو دیکھنے سے بھی میلی ہوتی ہے"۔

"آپ ہماری بمبئی دیکھیں تو جی ہرا ہو جائے شیخ صاحب"۔

"اُس بوڑھی کو چھوڑیئے نا پنڈت جی۔ بیچاری میں نرے نخرے کے سوا اب رکھا ہی کیا ہے؟"

"میرے دل کو عرصہ کے بعد سکون کا احساس ہوا ہے"۔ شیخ عبداللہ نے کسٹمز ہاؤس سے نکل کر گردوپیش نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے یہاں کتنا چین ہے۔ ایک افریقی بھی نظر نہیں آتا۔ یہاں لوٹ کھسوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔

پھر عبداللہ اپنے نگ گننے لگا۔ پہلے اپنے سامان کے، پھر فیملی کے۔ "بیگم" وہ بیوی سے گویا ہوا۔ "تم بچوں کو سنبھالو اور میں سامان کو دیکھتا ہوں"۔

"آپ اطمینان رکھیں شیخ صاحب"، پنڈت کرم چند اُسے سمجھانے لگا "یہاں

کوئی خطرہ نہیں۔"

مگر تین گھنٹے بعد جب پنڈت کرم چند جہاز میں لوٹا تو بڑا اسٹپٹایا سا نظر آتا تھا۔

"حد ہوگئی۔" اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "شیخ صاحب صرف دو منٹ کے لئے ہوٹل کے اندر گئے، بس اتنی دیر میں ہی تانگے والا اُن کا زیورات کا ٹرنک لے کر بھاگ گیا۔

"اچھا؟"

"اجیب کِستہ ہے" ہیرجی کا کالا سایہ گویا کسی افریقی کی طرح اُس کی تاک میں ہو۔ "سالے یہاں بھی امریکہ کے کالے چور ———"

"ہاں بھئی ہیرجی، یہاں بھی بھوکوں ننگوں نے بڑی بھاگڑ مچا رکھی ہے۔"

اسی اثنا میں جہاز کا افریقی نوکر کہیں سے ڈیک پر آنمودار ہوا۔

"ہم ناحق بھاگ آئے۔" ایک مسافر کہنے لگا۔ "کالا آدمی تو ہر جگہ موجود ہے۔"

ایک ہی رُوپ

"جیمو!" اندھا کانگا ٹائپ رائیٹر چھوڑ کر جیمو کے قریب سرک آیا۔

"ہاں!"

"میں سوچتا ہوں تمہاری صورت کیسی ہو گی۔ تم بھی میرے بارے میں یہی سوچتی ہو گی؟"

"تم تو سچ مچ اندھے ہو کانگا" اندھی جیمو نے بھی سویٹر بننا چھوڑ دیا اور ٹٹول ٹٹول کر کانگا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ تو ہے ہی میری رانی"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں مورکھ، مگر تمہاری باتوں سے مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ تم من کی آنکھیں بھی کھو چکے ہو۔"

"من کی آنکھوں سے فائدہ ہی کیا ہے؟ میرا جی تو چاہتا ہے تمہاری شکل دیکھوں۔ جنم کا اندھا ہوں پھر بھی ہر دم دل ہی دل میں شکلیں بناتا رہتا ہوں۔" کانگا اپنا دوسرا ہاتھ جیمو کی ناک پر پھیرنے لگا۔ "کل میں نے ایک چہرہ بنایا جیمو۔

تمہارا چہرہ۔"

"تم نے تو کبھی انسانی چہرہ دیکھا بھی نہیں، پھر میرا چہرہ کیسے بنا لیا؟" جیمو نے اپنا سر کانگا کے کندھے پر ٹیک لیا۔

"تمہیں اپنی انگلیوں سے ٹٹول ٹٹول کر۔ میں نے وہ چہرہ ممی فشر کو بھی دکھایا تھا۔"

"پھر وہ کیا کہنے لگیں؟"

"انہوں نے ہنس کر کہا تھا کہ یہ چہرہ تمہاری جیمو کے چہرے سے ہو بہو ملتا ہے۔"

"کانگا!"

"ہاں۔"

"مجھے تمہارا چہرہ دیکھنے کی خواہش کبھی نہیں ہوئی۔"

"پھر بھی آدمی سوچتا تو ضرور ہے۔"

"نہیں، میں تو نہیں سوچتی۔ مجھے ممی سے بے حد پیار ہے مگر اپنے من میں کبھی ان کی تصویر بھی نہیں ٹانگی۔"

"وہ کیسی باتیں کرتی ہو؟"

"تم نہیں سمجھتے پگلے۔ پیار شکلوں کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ پیار کی ہر شکل پیاری ہوتی ہے۔"

"ونڈرفل، جیمو!" جانے ممی فشر کہاں سے آنمودار ہوئی۔ "تمہاری باتیں تمہاری شکل سے بھی زیادہ پیاری ہیں۔"

کانگا سرعت سے ٹائپ رائیٹر کے قریب آبیٹھا۔ جیمو بھی شرم سے سرخ ہو کر تیز تیز سوئیٹر بننے لگی۔

"مجھے اندر نہیں آنا چاہیئے تھا بچو۔ مگر کئی بار ماں کو بے اختیار پیار آتا ہے
تو چوم چوم کر اپنے سوئے ہوئے بچے کی نیند خراب کر دیتی ہے۔"

"نہیں ممی، بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو کسی پری کی بجائے ماں کو دیکھ کر اور
زیادہ خوش ہوتا ہے۔"

"تم واقعی بڑی پیاری باتیں کرتی ہو میری بچی" ممی نے نہایت شفقت سے
جیمو کی پیشانی چوم لی۔

"جیمو تو صرف باتیں ہی کرنا جانتی ہے ممی" کانگا اب کھٹا کھٹ ٹائپ کرنے
لگا تھا۔ "کام تو سارا دن میں ہی کرتا رہتا ہوں۔"

ممی فشر کانگا کی پشت پر کھڑی ہو کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔
"کیا ٹائپ کر رہے ہو، بیٹے؟"

"آپ خود ہی پڑھ لیں نا ممی۔ میں تو اندھا ہوں۔"

"نہیں بیٹے، تم اندھے نہیں ہو۔ تمہاری آنکھیں میں ہوں۔ میری آنکھیں
تم سب کی آنکھیں ہیں۔"

"میں ابھی ابھی ایک کہانی ٹائپ کر رہا تھا ممی۔ ذرا پڑھیئے اسے" کانگا نے
ممی کو ایک ٹائپ شدہ ورق دیتے ہوئے کہا۔

ممی فشر ٹائپ شدہ عبارت پڑھنے لگی۔

"ہم سب اندھے ہیں۔ مگر پچھلے جنم میں ہم اندھے نہ تھے۔ ایک دفعہ ہم نے
دو نہایت خوبصورت آنکھیں دیکھ کر خدا سے دعا مانگی کہ اگلی بار ہماری آنکھیں بھی
ایسی ہی ہوں۔

خدا نے ہماری دعا قبول کر لی۔ لیکن یہ دو آنکھیں وہ ہم بدنصیبوں دعا کرنے والوں کو کیسے دے سکتا تھا؟ بہت سوچ بچار کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر فرشتوں کو ایک ترکیب سوجھی۔ خدا نے اس ترکیب کے مطابق ہمیں اندھا بنا دیا اور ممی فشر کی دو خوبصورت آنکھیں ہمارے حوالے کر دیں۔

خدا ہماری ان دو آنکھوں کو ہمیشہ سلامت رکھے!"

کہانی پڑھ کر ممی فشر کی آنکھوں کی خوبصورت نیلاہٹ گیلی ہو گئی جیسے نیلا آسمان ابرِ رحمت سے پُرنم ہو جائے۔ اُس نے دل ہی دل میں دعا مانگی "یہ آنکھیں ان اندھے بچوں کی امانت بنی رہیں خدایا!"

"چپ، کیوں ہو گئیں ممی؟"

"تمہاری کہانی بڑی اچھی ہے بیٹے۔ تم اپنے دیش کے بہت بڑے کہانی کار بنو گے۔"

"سچ ممی؟"

"ہاں بیٹے، خدا کبھی کسی سے بے انصافی نہیں کرتا۔ کچھ لیتا ہے تو چوگنا کر کے لوٹاتا ہے۔"

"مگر جیمو تو مجھے باؤلہ ہی سمجھتی ہے۔"

"باؤلے ہی تو ہو۔" ممی فشر نے اُس کی ناک پکڑ کر کہا۔ "کیوں جیمو، تمہیں میرے بیٹے کا باؤلہ پن اچھا لگتا ہے نا؟"

"آپ بڑی شریر ہیں ممی۔" جیمو کی ایک سلائی کسی کنواری کی طرح سُرخ ادن میں منہ چھپا کر بے اختیار ہنسنے لگی۔

"پیراڈائز فلورسٹ نے ٹوکریوں کا ڈھیر آرڈر بھیج رکھا ہے۔ دیکھوں جا کر۔"

جب ممی فشر چلی گئی تو کانگا کہنے لگا۔ "ممی بڑی اچھی ہے۔"

"ہاں، ممی بڑی اچھی ہے۔"

ممی فشر باسکٹ روم میں داخل ہوئی تو اُس کی چاپ گویا گنگنائی۔ "م۔ ممی!"

"کیوں ایلفی، پیراڈائز کا کام ختم ہوا؟"

"آج ختم کر کے ہی اٹھیں گے ممی۔"

"بس ایک گھنٹہ اور ممی۔" لیمبا کی انگلیاں کام پر نہایت تیز دوڑ رہی تھیں۔ بوڑھے کا جواں سال عزم دیکھ کر ممی فشر کو خیال آیا کہ اگر زندہ رہنے کی خواہش جواں رہے تو آدمی کبھی بوڑھا نہ ہو۔ عمر دراصل عمر نہیں ہوتی، ایک ذہنی حالت ہوتی ہے۔

"اب تمہارا زکام ٹھیک ہے نا بیٹا؟" لیمبا ممی سے ملیں پچیس سال بڑا ہو گا مگر اس سے بات چیت کرتے ہوئے ممی کو یہی معلوم ہوتا جیسے وہ اس کا سب سے چھوٹا بچہ ہو۔ انسانی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ہمارے رشتوں کی اساس عمروں اور خاندانی شجروں کی بجائے اُن ہی جذبات پر ہو جو ہم ایک دوسرے کے لئے محسوس کرتے ہیں۔

"بالکل ٹھیک ہوں ممی" جیسے بوڑھے نے کہا ہو "ممی، تمہاری ممتا بھری گود میں نہ بڑھاپا ہے نہ اندھاپن، کوئی بیماری نہیں، سُکھ کے سوا اور کچھ نہیں۔"

ممی فشر کے بلائینڈ ہاؤس کے یہ سب اندھے نہایت شوق سے اپنے اپنے کام میں مگن تھے، گویا ٹوکریوں کے نزاشے بُننے کی بجائے وہ اپنی بے ضرر خواہشات کو آراستہ کر رہے ہوں۔ اُن کے مسرت آگیں سعی و عمل نے ممی فشر

کی روح کو چھولیا اور وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی کہ میری اس اندھی اولاد کے ہاتھ اندھے نہیں، ان کے ہاتھ دیکھتے بھی ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔ ان کے عمل میں ایک جادو ہے جس سے ان سب کی بے چارگی خود بخود موت کی گود میں جا لیٹتی ہے۔ ان کا سیدھا سادا انہم انسانی ضروریات دیکھ نہیں پاتا۔ مگر انہیں محسوس کرکے غیر معمولی ذہانت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو حسن و تعمیر کی افزائش کے لئے یہ لوگ بھی پیش پیش ہو سکتے ہیں۔

نوعمر جو کی ایک نہایت نفیس ٹوکری بناتی ہوئی کچھ گنگنا رہی تھی، ممی نے اپنی نگاہ اُس کی پتلی پتلی متحرک انگلیوں پر جما دی۔

"ممی" جانے جو کی کو کیونکر پتہ چل گیا کہ ممی فشر اُس کی جانب دیکھ رہی ہے "میری ٹوکری کیسی لگ رہی ہے؟"

"بہت خوبصورت ہے چائلڈ"

"ممی جب کوئی الیلی اس ٹوکری میں پھول رکھ کر گھر لے جائے گی تو میری محنت پھولوں سے سج دھج کر اور بھی خوبصورت لگے گی"

ممی فشر وہاں سے اٹھ کر باہر آئی تو کاریڈار میں ایک اندھی لڑکی بیٹھی لنچ کے لئے آلو چھیل رہی تھی۔

"ہیلو کانیو، آلو چھیل رہی ہو؟"

"ہاں ممی"

ممی فشر بھی گھڑی بھر کے لئے وہیں بیٹھ گئی۔

"کانیو، تمہارے بابا کی چٹھی آئی تھی، وہ تمہارا بیاہ کرنا چاہتا ہے"

آلو کا سیاہ چھلکا اتر گیا تو اس کا سفید بے داغ گودا مسکرانے لگا۔

"اگر تم بیاہ کر کے چلی گئی تو بڈھی ممی کے لیے فنگر چپس کون بنائے گا"

"ممی"

"ہاں"

"میرے بابا کو اچھی طرح بتا دینا کہ کیسا آدمی ڈھونڈے"

"میں خود تمہارا ور ڈھونڈوں گی بیٹی"

"ہمارے قبیلے میں ایک رسم ہے ممی، منگنی سے ایک دن پہلے گبرو جنگل میں جا چھپتا ہے اور لڑکی اسے ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ میں بھی ابھی ابھی اپنے گڈریئے کی تلاش میں بہت دور جا پہنچی تھی اور اسے پا لیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا 'ارمی کا نیو، تمہاری آنکھیں بند ہیں، پھر مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا؟' میں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول کر اس کی طرف پھیلا دیں اور کہا۔ 'یہ دیکھو میری سفید ممی کی آنکھیں، میں انہیں ہر دم اٹھائے پھرتی ہوں اور جدھر چاہوں جا نکلتی ہوں'۔"

"میں تمہارے لیے ایک بڑا سجیلا شہزادہ ڈھونڈوں گی" سفید ممی نے بے اختیار اس گول مٹول آلو کو سیاہ چھلکے سمیت چوم لیا۔

جب ممی فنشر اپنے آفس میں پہنچی تو اس کی اسسٹنٹ مس واڈلے بلاہنڈ ہاؤس کی کارسپانڈنس ٹائپ کر رہی تھی۔

"گڈ مارننگ، واڈی"

"مارننگ، ممی۔ اب یہ ٹائپ رائٹر بدلوا دیں ممی، بہت بڈھا ہو گیا ہے۔"

"واڈی" ممی اپنی کرسی پر بیٹھ کر گویا ہوئی "یہ ٹائپ رائٹر ابھی ریٹائر نہیں ہوگا

چاہتا۔ اور کسی کو اُس کی مرضی کے خلاف کام سے علیحدہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر اب یہ بہت پرانا ہو چکا ہے"

"ذرا اس کی آواز پر کان دھرو۔ بڑھاپے کے باوجود کتنی بانکی کھٹ کھٹ ہے اس میں۔ یہ ٹائپ رائٹر بھی میری طرح اس اندھی دنیا کا پرانا خدمت گار ہے اور یہاں کے سب مسائل کو خوب سمجھتا ہے۔" ٹائپ رائٹر کی جانب بغور دیکھتے ہوئے ممی کے ذہن میں پرانی یادوں کی گٹھڑی کھل گئی "واڈی، کئی بار ٹائپ کرنے بیٹھتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میری بجائے یہ ٹائپ رائٹر ہی سوچ رہا ہو اور سوچ سوچ کر اپنے آپ الفاظ ٹائپ کر رہا ہو۔ اس کا تدبر آڑے وقتوں پر ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہا ہے۔"

تھوڑی دیر ممی چپ چاپ کئی بکھری ہوئی یادیں بڑے قرینے سے سمیٹتی رہی۔

"نہیں واڈی، میرے اس پرانے ساتھی کو اپنی پوزیشن پر جمار ہنے دو۔"

واڈی نے دستخط کے لئے ممی کو ایک ٹائپ شدہ چٹھی دی اور ممی آنکھوں پر عینک سیٹ کر کے بلائینڈ ہاؤس کے دفتری کام میں مشغول ہو گئی۔

"ممی" کچھ دیر بعد واڈی نے اپنے کام سے سر اٹھا کر کہا۔ "کالے لوگ بڑا شور مچا رہے ہیں کہ ہم سفید قومیں یہاں سے بوریا بستر اگول کر لیں۔"

"ہمیں سیاسیات سے کیا غرض، واڈی؟ ہمارا کام تو اپنا فرض بجا لانا ہے۔"

"مگر ممی، حالات بہت بگڑ رہے ہیں۔ مس ایڈون کہہ رہی تھی کہ اس ہوم لیو کے بعد وہ بلجیم سے نہیں لوٹیں گے۔"

"یہ کوتاہی ہے۔ واڈی، ذرا سوچو اگر ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں تو

ان کالے اندھوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ انہیں ہماری رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔"

"یہ درست ہے ممی، مگر کالی قوم ہم سے نفرت کرتی ہے"۔ ہم اُس کی مرضی کے بغیر اُس کی خدمت نہیں کر سکتے۔"

"میری بیٹی، اگر خدمت کرنے والے کا جذبہ سچا ہو تو اس پر خدا اپنی راہیں کبھی بند نہیں کرتا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔" ممی فشر گویا اپنی اسسٹنٹ کے ڈگمگاتے یقین کو تھام رہی ہو۔

مس واڈلے بڑی متاثر نظر آتی تھی، شاید جی ہی جی میں تہیہ کر رہی تھی کہ ممی کو اپنا آئیڈیل بنا کر سارا جیون اُس کے افریقی بلائینڈ ہاؤس کی خدمت میں گزار دیگی۔

"جیمو۔"

"ہاں، کانگا"

"بندھے ہوئے آدمی کو رسیاں توڑنے سے پہلے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں جیمو کہ ہمارا ملک بھی اتنا عرصہ کس کر بندھا رہا، اب آزادی کے بعد اس کا انگ انگ دُکھ رہا ہے۔"

"ہاں کانگا۔"

"اور اب ہمیں ممی فشر کی سی انگنت ماؤں کی ضرورت ہے جو ہمارے دیش کے زخمی بدن کی مرہم پٹی کریں۔"

"کانگا۔"

"ہاں۔"

"میرے بھائی نے کہا تھا کہ ممی کی جان خطرے میں ہے۔ ہمارے لوگ چاہتے ہیں کہ سارے دیش میں ایک چیتا بھی نظر نہ آئے۔"

"نہیں۔" کانگا کے ہاتھ کے جھٹکے سے اُس کا ٹائپ رائٹر میز سے گرتے گرتے بمشکل بچا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ممی کو کوئی طاقت ہم سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔"

"سب بدیشی دھڑا دھڑ ملک خالی کر رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں اگر ممی چلی گئی تو ——"

"تو میں اپنی من کی آنکھیں بھی اندھی کر لوں گا، بھیمو۔"

"ہماری قوم کو ممی کے رنگ سے نفرت ہے۔ اگر وہ بھی ہماری طرح کالی ہوتی تو ہمارے سب لوگ اُس کی پوجا کرتے۔"

"نہیں نگلی، تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا کہ ممی کا کوئی رنگ نہیں۔"

"وہ تو ہم اندھوں کی باتیں ہیں کانگا۔ یہ آنکھوں والے تو روپ رنگ کے بغیر کچھ محسوس ہی نہیں کرتے۔"

"ممی بڑی ڈانواں ڈول ہے۔ آج اس سے باتیں کرتے کرتے میرے جی میں آئی کہ اُس کی چھاتی پر سر رکھ کر بے اختیار رُوؤں۔"

"ہاں کانگا، ممی آج کل بڑی کھوئی کھوئی سی ہے۔"

"شہر کے سبھی گورے جا چکے ہیں، اگر ممی چلی گئی تو ——"

"تو میں سچ مچ اندھی ہو جاؤں گی کانگا۔"

"مگر ممی یہاں سے کبھی نہ جائے گی۔"

"ہاں کانگا، ممی کو نہیں جانا چاہیے۔"

"واڈی" ممی فشر بڑی بے چین تھی۔

"ممی؟" مس واڈلے بڑی پُرسکون تھی۔

"فادر گیرٹ نے یہاں چرچ بنواتے ہوئے پتھر خود اپنی پیٹھ پر ڈھوئے تھے۔"

"مجھے معلوم ہے ممی۔"

اور اس کی یہ خواہش تھی کہ یہیں چرچ یارڈ میں اُس کی قبر بنے۔"

"فادر کو اپنے گرجے سے بڑا پیار تھا۔"

"پھر وہ چلا کیوں گیا، واڈی؟"

واڈی نے سوچنے کے انداز میں سر جھکا لیا۔

"جا تو سبھی چکے ہیں واڈی۔ مگر یہ لوگ کیوں گئے، فادر گیرٹ، ڈاکٹر پیٹی سن ریورینڈ گلکل —— ؟ یہ لوگ تو یہاں اپنا گھر بنا چکے تھے۔"

"ممی، ہم یہاں سے چلے بھی جائیں تو در اصل ہم یہیں رہیں گے۔ یہ گرجے، اسکول، اور اسپتال ہمارے ہی وجود ہیں، ہماری روحوں کے خط و خال ہیں۔ اب ہم ہمیشہ یہیں رہیں گے۔" مانو مس واڈلے کے منہ میں، ممی کی زبان بول رہی ہو۔

"مگر میری ہمت اب جواب دے رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ گھبرائیے نہیں ممی، وقت کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ دور بھی گذر جائے گا۔"

"یہ لوگ کیوں چلے گئے؟ جب تک یہ رکے رہے میرا حوصلہ بندھا رہا۔ اب بیٹھے بیٹھے دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

مس واڈلے حیرت سے ممی فشر کا منہ تکنے لگی۔

"ممی چند ماہ پہلے جب میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی تو آپ کی

آواز سن کر بہت اطمینان سے بیٹھ گئی تھی مجھے اپنے اطمینان پر خود تعجب ہونے لگا تھا، لیکن اب آپ کی پریشانی پر تعجب ہو رہا ہے۔"

"میرا دل اسی لئے رو رہا ہے کہ میں اپنا بلائینڈ ہاؤس چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔"

"تو نہ جائیے۔ آپ جانے کے متعلق سوچتی ہی کیوں ہیں؟ ہم دونوں مل کر بدستور کام کرتی رہیں گی۔ ان بدلے ہوئے حالات میں ہمارا مشن تو نہیں بدلا۔"

"آج صبح مجھے ایک اور دھمکی موصول ہوئی ہے" ممی مس واڈلے سے آنکھیں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم فوراً چلے جائیں۔"

"ان لوگوں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"راوتی کو بھی پہلے ایسی ہی دھمکیاں موصول ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے سب چارے کا سارا خاندان قتل کر دیا۔"

"آپ پولیس کو اطلاع کر دیں ممی"

"پولیس کے ایک دو آدمی تو ہر وقت یہاں موجود رہتے ہیں لیکن جب یہ لوگ حملہ کرتے ہیں تو پولیس کی دال نہیں گلتی۔"

"تو پھر کیپٹن رابرٹ سے مدد طلب کیجئے۔ اس کا دستہ ابھی تک یہیں ہے۔"

"کیپٹن بھی دو ایک ہفتہ میں یورپی نکاس کے بعد واپس جا رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتیں تو وہ ہماری مدد سے قاصر ہے۔ میں بہت پریشان ہوں واڈی۔ اگر چند دوسرے لوگ بھی رک کے رہتے تو ہمیں ایسی مشکل پیش نہ آتی۔ اب سوچتی ہوں تمہیں روک کر بھی میں نے غلطی ہی کی تھی۔"

"نہیں ممی، آپ نے میرے ڈگمگاتے وجود کو تھام لیا تھا۔ اب میں اپنے پاؤں

پر مضبوطی سے کھڑی ہوں۔"

"مگر میرا ایمان تو ہل رہا ہے واڈی"

"ممی!؟ گویا مِس واڈے کے سامنے بلائینڈ ہاؤس کی بنیادیں ہلنے لگی

ہوں۔

"اُدھر نگو نے بلجیم سے لکھا ہے کہ اگر میں جلد ہی اُس کے پاس نہ پہنچی تو وہ

خود مجھے لینے چلے آئے گا۔"

مِس واڈے ممی کے چہرے کی طرف بغور دیکھتی رہی۔ "کیا یہ وہی ممی ہے؟"

"ہمیں فوراً کوئی تدبیر کرنا چاہیے بیٹی۔ فادر گیرٹ کہا کرتا تھا کہ جب طوفان آئے

کھڑکیاں بند کر لو۔"

مس واڈے نے اپنے دل کی کھڑکیاں یکسر کھول دیں اور سوچنے لگی کہ ممی کا

لہجہ شرمسار کیوں ہے یہ آواز ممی کی نہیں، کسی انسان کی ہے کیونکہ انسان بدلتے

رہتے ہیں، ان کی ذہنی کیفیت ایک سی نہیں رہتی، مگر ممی کبھی نہیں بدلتی، ممی

انسان نہیں، نیکی کا ایک نام ہے اور نیکی ہمیشہ ایک سی رہتی ہے۔ اٹل ہے۔

"بیٹی، کیپٹن رابرٹ آج شام کو یہاں آ رہا ہے۔ وہ ہم سے آخری بار پوچھنا

چاہتا ہے کہ ہم یہاں سے جائیں گی یا نہیں۔"

واڈی ممی کے چہرے میں ممی کو ڈھونڈتی رہی۔

"شاید خدا کی یہی مرضی ہے کہ ہم یہاں سے چلی جائیں۔ کیپٹن کے آنے سے

پہلے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

مس واڈے ایک بدنما ادھیڑ افریقی بچے کا منہ دھوتی ہوئی

اس کے معصوم ذہن میں جھانک رہی تھی مانو اپنے کنوارے احساس پر سر ٹیکے ممتا کی صدا پر ہمہ تن گوش ہو۔

سب بچے اپنے بھولپن کی وجہ سے خوبصورت ہوتے ہیں، کالے بھی اور گورے بھی۔ ہمارے بچے بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ ان کی کوئی ذات نہیں ہوتی کیونکہ انہیں ذات پات کا علم ہی نہیں ہوتا۔

واڈی کا جی چاہا کہ دوڑ کر سارے جہاں کے بچوں کی ننھی منّی انگلیاں تھام لے۔ ممی بن جائے۔

اس نے بے اختیار افریقی بچے کا میلا کچیلا مُنہ چوم لیا۔ یکایک اس کے چہرے پر گھنی فکر جھریاں بن بن کر لٹکنے لگی۔ "اگر ہم یہاں سے چلے گئے تو ہمارے اندھے کنبے کو کتنا بڑا صدمہ پہنچے گا!"

"م ـــــ ممی!" گویا اُس کی گود میں بیٹھے کالے بھجنگ بچے کا سارا بدن پکار اٹھا۔

مس واڈے نے بچہ سینے سے چمٹا لیا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ اگر ممی چلی گئی تو میں ممی بن جاؤں گی۔"

مس واڈے بالکل ممی فشر کی مانند اپنی دائیں کنپٹی کے پاس بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"لیکن ممی چلی گئی تو بلائینڈ ہاؤس کے سب مکین پاگل ہو اٹھیں گے، مجھے ممی نہیں کہیں گے۔ میں ممی کی جگہ کیسے لے سکتی ہوں؟"

مس واڈے کی آنکھیں بلائینڈ ہاؤس کی دیوار کی طرف تکتی تکتی وہیں جا کھبیں اور اُس کی اندھی فکر نے ذہن کی ایک نہایت نازک ڈالی

پر جھول جھول کر اُسے جواب دیا "پیار شکلوں کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ
پیار کی ہر شکل پیاری ہوتی ہے"

جامبو، جوگندر پال

'جامبو' افریقی زبان میں سلام کا مترادف ہے۔ میں کہتا ہوں۔ جامبو، جوگندر پال! ایک لکھنے والا اپنے کسی ہم سفر سے مل کر اور کیا کہہ سکتا ہے؟

کچھ اسی انداز میں پچھلے برس اسی موسم میں کراچی میں قرۃ العین حیدر نے میرا استقبال کیا تھا، جیسے ان کے قریبی ملنے والے 'اینی' کہہ کر یاد کرتے ہیں میں نے اینی سے کہا تھا کہ قرۃ العین کا تلفظ ادا کرنے کے لئے تو گلے کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ میرے لئے بھی یہ 'اینی' ہی ٹھیک ہے۔ انہی دنوں اینی کا ناول "آگ کا دریا" چھپ کر آیا تھا۔ ایک دوست نے اس ناول کی جلد بازار سے لے کر نذر کی اور کہا "اب اس پر اینی سے آٹوگراف ضرور لے لیجئے۔ اینی نے لکھا "دیوندر ستیارتھی کے لئے۔ جو ان لوگوں میں سے ہیں، جن کی وجہ سے آج کے ہولناک دور میں بھی یہ اُمید سی بندھ جاتی ہے، کہ اردو تہذیب کی انسان پرستی کی روایات ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔" اب ٹھیک یہی بات میں جوگندر پال کے لئے کہہ سکتا ہوں کیونکہ ان کے افسانوں میں جو افریقہ سانس لیتا ہے، وہ مجھ سے سینکڑوں میل دور ہو کر بھی بہت قریب ہے۔

لیکن میں نے اپنی سے کہا تھا "آگ کا دریا" تو میں نے لکھا۔ نام آپ کا ہو گیا۔" اور اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا تھا، جس میں اپنی تو محض مسکرا کر رہ گئی تھی

اب جوگندر پال سے بھی وہی بات کہنے کو طبیعت مچل رہی ہے۔ لیکن یہ انداز میرا نہیں، پطرس کا ہے۔ لیجئے وہ قصہ بھی سُن لیجئے۔ ن۔م۔ راشد مجھے آل انڈیا ریڈیو کے ہیڈ کوارٹرس میں لے گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب راشد کی 'ماورا' شائع ہو چکی تھی اور میرے ہاتھ میں "میں ہوں خانہ بدوش" کی ایک جلد تھی، جو میں خاص طور پر اردو کے اس عظیم نثر نگار کو نذر کرنے کے لئے لے گیا تھا۔ پطرس نے چھوٹتے ہی کہا "دیکھئے صاحب میں نے کچھ نظمیں کہیں، جو 'ماورا' کے نام سے شائع ہو گئیں اور نام راشد کا ہو گیا۔" اس پر قہقہہ پڑا۔ پھر پطرس کے ہاتھوں میں میری وہ تصنیف پہنچی تو بولے "دیکھئے صاحب، خانہ بدوشی تو میں نے کی۔ آپ کیسے اس کتاب کے مصنف بن بیٹھے؟" میں نے بلا جھجک جواب دیا "جناب اس لمحے تک تو میں خود کو ایک خانہ بدوش ہی سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ خانہ بدوش تو آپ ہیں، اور میں آل انڈیا ریڈیو کا ڈائرکٹر جنرل ہوں۔"

اپنی نے یہ قصہ سنا تو بہت خوش ہوئی۔ کسی تصنیف کی تعریف کرنے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ ہمیں محسوس ہونے لگے کہ کاش یہ ہم نے لکھی ہوتی۔

جوگندر پال کو نیروبی میں رہتے بارہ برس ہو گئے ہیں، ایک روز وہ کہنے لگا "جب چودہ برس پورے ہو جائیں گے، تو میں افریقہ سے لوٹ آؤنگا۔

اور دیکھیئے میرا ارادہ ہے کہ اپنے اس بن باس پر ایک بھرپور ناول لکھ ڈالوں"

میں نے کہا" اس ناول کے شائع ہونے پر بھی میں یہی کہوں گا۔ لکھا میں نے، نام جوگندر پال کا ہو گیا"

نئی دلی کے 'رائٹرس گروپ' میں جوگندر پال نے اپنا افسانہ 'دھرتی کا کال' پڑھ کر سنایا تو بیشتر سننے والے یہی محسوس کر رہے تھے کہ وہ افریقہ کی دھرتی پر سانس لے رہے ہیں۔ میں نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا" یہ داداکلمو تو میں ہوں اور داداکلمو کے ماتھے کی برفانی جھریاں بھی میرے ہی ماتھے کی جھریاں ہیں"

یہی بات زیر نظر مجموعے کی بیشتر کہانیوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

جس نئے معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس میں دلیس دلیس کی آواز کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے ساری دنیا ایک شہر ہو۔ اور لکھنے والے کو شہر کی دائی کی طرح گھر گھر کی خبر رہنی ہی چاہیے۔

اپنی نے اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے بتایا" اجی ایک مدت تک گڑیوں کا سلسلہ رہا۔ ہر طرف گڑیاں ہی گڑیاں تھیں۔ ہم نے گڑیوں کا ایک اسکول کھول رکھا تھا۔ ایک قصہ سنیئے، لیکن اس پر ہنسیئے گا نہیں۔ میری ایک جرمن سہیلی تھی جس نے مجھے سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ میں اپنی لیڈی بلبنڈا اسے اس کے گڈے کا بیاہ کر ڈالوں۔ جرمن سہیلی کی بات بڑی عجیب سی تھی۔ لیکن میں یہ بھی تو نہ چاہتی تھی کہ وہ روٹھ جائے۔ مگر صاحب عین برات کے وقت میری جرمن سہیلی نے کسی بات پر بگڑ کر کہا کہ میرا گڈا خالص جرمن ہے اور سیدھا برلن سے آ رہا ہے اور تمہاری لیڈی بلبنڈا اگرچہ بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے اور اس لئے ہندوستانی ہے بس ایک دم بگڑ گئی۔ چنانچہ نہ صرف برات لوٹا دی بلکہ عرصہ تک اینٹی جرمن جذبات دل میں اٹھتے رہے۔ سمجھے جناب!"

میں نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا۔ "مجھے تو بالزاک کی بات یاد آرہی ہے۔ دنیا میں خوبصورت ترین چیزیں تین ہیں کھلے بادبانوں والی تیز رفتار کشتی، سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا، اور ڈانس کرتی ہوئی عورت"۔

"اور میری وہ لیڈی بلینڈا تو واقعی اُس جرمن گڈے سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی"۔ اینی نے مسکرا کر کہا۔

میں نے اینی کو اس افریقی گڑیا کی بات سنائی، جسے میری افریقہ والی موسی کی لڑکیاں افریقہ سے لائی تھیں۔ اس گڑیا کے خدوخال اگرچہ بہت خوبصورت نہ تھے تاہم آج تک اس کی یاد دل پر نقش ہے۔ موسی تو واپس افریقہ چلی گئی۔ لیکن نٹ کھٹ لڑکیاں ہمارے ہاں رہ گئیں۔ میرے ساتھ گڑیا اور گڈے کا بیاہ رچانے کے لئے۔ جب وہ مجھ سے روٹھ جاتیں تو افریقی زبان میں باتیں کرنے لگتیں۔ میری تو لے دے کر ایک ہی افریقی لفظ تک رسائی تھی۔ مکاٹی، جو روٹی کا مترادف ہے اس سے آگے میرا ذہن بالکل نہ چل سکا۔ انہوں نے تو گڑیا کے ساتھ سانی گڈے کو بھی افریقی سکھانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

میرے کمرے میں ٹیک شیلف پر ٹیگور کی لڑکی کا جو مجسمہ پڑا ہے اُس کی ادا تو ہو بہو ان لڑکیوں کی افریقی گڑیا سے ملتی ہے۔ وہ افریقی گڑیا میں سنبھال کر نہ رکھ سکا۔ پھر ایک بار ایک افریقی لڑکی سے ملاقات ہوئی جس کی پرورش اور تعلیم بڑودہ کے ایک گنجیا ہما و دیالیہ میں ہوئی تھی یہ آج سے بیس برس پہلے کا واقعہ ہے اس نے بتایا تھا کہ وہ واپس افریقہ جا کر اپنے دیس کو جگائے گی۔

مجھے معلوم نہیں کہ وہ افریقی لڑکی اب کہاں ہے۔ لیکن جب جگندر پال نے اپنا افسانہ "ایک ہی رنگ روپ" پڑھ کر سنایا تو اندھی لڑکی کی آواز میں نہ صرف مجھے افریقی گڑیا کی آواز سنائی دی بلکہ اس کی آواز میں جیسے اس افریقی لڑکی کی آواز بھی گونج اُٹھی ہو، جس نے کہا تھا کہ وہ اپنے دیس کی سیوا کرے گی۔

"ایک ہی روپ" میں جوگندر پال نے فن کی عظیم بلندی سے پکار کر ہمارے کانوں تک یہ آواز پہنچائی ہے:

"پیار شکلوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ کیونکہ پیار کی ہر شکل پیاری ہوتی ہے۔"

اس افسانے میں ممی کا کردار واقعی اس ماں کا کردار ہے، جس کی ہتھیلی پر اس کے اندھے بچوں کی آنکھیں جھانکتی ہیں۔ ممی دراصل کسی انسان کا نام نہیں ممتا تو ابدی نیکی کا ایک نام ہے۔

"جامبو رفیقی" میں جوگندر پال نے بتایا ہے کہ نئی تہذیب نے کالی مٹی کی اولاد سے ان کا قبائلی پن تو چھین لیا۔ لیکن اس کے عوض اسے کچھ نہیں بانٹا۔ وہی ریلوے جنکشن، افریقی بے گھری اور بے سر و سامانی کا ایک سمبل ہے، جہاں دو افریقی ایک دوسرے کو "جامبو رفیقی" کہتے ہیں۔ ان کی بات چیت کی یہ گھڑی ہماری تہذیب کے لیے ایک بہت بڑی چنوتی ہے۔

جوگندر پال کے افسانوں میں جو توازن ہے، یہ اس کی شخصیت کی دین ہے وہ اپنے ساتھ روشنی لاتا ہے۔ پرانی روایت ہے کہ فرشتوں کی تصویروں میں نور ہی نور ہوتا ہے، رنگ نہیں۔ لیکن جوگندر پال رنگوں کے استعمال سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ اس کے افسانوں کے رنگ چپکے سے ہمارے ذہن میں اتر جاتے ہیں۔ اس کے کردار ہماری کلپنا میں چھوٹی بڑی لکیریں اور دائرے اور قوسیں بناتے ہیں، جن پر گہرے مشاہدے کی چھاپ ہے۔

جوگندر پال عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ لیکن اس کی ذہنی عمر بہت بڑی ہے حال ہی میں میں نے ایک افسانہ لکھا ہے، اس کا عنوان ہے "گاڑی بھر راستہ" اس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے کہ نئی نسل کا ایک لکھنے والا پرانی نسل کے ایک بڑھے کہانی کار کو اپنے مدمقابل ایک دم بونا سمجھتا ہے۔ گویا نئی نسل ایک دم

بارہ گزوں پر مشتمل ہے۔ بوڑھا کہانی کار کہتا ہے تخلیق کے لمحے ہم عمر ہوتے ہیں میرے بھائی!

یقین کیجئے۔ مجھے تو جوگندر پال ہی دیوندر ستیارتھی معلوم ہو رہا ہے، آپ کہیں گے نوجوانوں کو بوڑھا بنانے کا یہ نسخہ کہاں سے ہاتھ لگا؟

لاہور میں پچھلے برس اردو افسانے سے متعلق ایک سمپوزیم میں میں نے کہا تھا "دیکھیئے حضرات، آپ کے ہاں جو افسانہ نگار ابھی پیدا نہیں ہوا، میں تو اس کا بھی بیٹا بننے کو تیار ہوں، میں بوڑھا نہیں ہوں، میں تو نئی نسل کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتا ہوں۔ تا کہ نئے 'گڈریئے' پڑھ سکوں، نئے اشفاق احمد سے مل سکوں......"

اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے ساتھ چلنے والوں میں جوگندر پال کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

آندرے ژید نے ایک بار کہا تھا "سچی بات تلخی سے کہی جاتی ہے اور جھوٹی محبت سے"۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا، جیسے میں یہ بھی نہیں مانتا کہ فرشتوں کی تصویروں میں صرف نِرا ہی نور ہوتا ہے، رنگ نہیں۔ میری کلپنا میں تو افریقی گڑیا بھی بے زبان نہیں۔ اپنی ہی ہندوستانی گڑیا کو شکایت ہے کہ ذرا سی بات پر بگڑ کر جرمن گڈے کی برات کیوں لوٹا دی گئی۔ آخر جرمن لڑکی نے یہی تو کہا تھا کہ لیڈی بلینڈا کا نام رکھ ڈالنے کے باوجود وہ ہے تو ہندوستانی ہی۔ یہ تو سچ بات تھی۔ اِسے پیار سے کہہ لیں خواہ تلخی سے۔

ایک نیگرو کہاوت ہے۔ بھولا آدمی کہتا ہے کہ میرا گواہ یورپ میں ہے مگر جوگندر پال نے سچ کی آواز پر پہرہ نہیں بٹھایا۔ اس کے لیئے اس کا افسانہ 'معجزہ' پڑھیئے اس میں افریقہ کی اس جھیل کی تصویر دکھائی گئی ہے، جہاں پیروں کے نیچے زمین

ڈولتی ہے۔ کیونکہ حصیل کا پانی دراصل زمین کے نیچے ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ جھوٹ کے پیروں تلے سچ کی آواز ڈول رہی ہے۔

'ہر جگہ' موضوع اور ماحول کے مطابق بڑی تیز رو کہانی ہے' جس میں جوگندر پال نے بڑی چابک دستی سے جرم کا ایک ہمہ گیر تصور ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

'سب کا سوال' میں مکوڑی ایک زندہ کردار ہے' جو موت کے بعد خدا کی عدالت میں مخلوق کی شکست پر جرح کرنے کے لئے پہنچتا ہے۔ اور اسی طرح 'منڈا' ایک عظیم افسانہ ہے' جس میں ایک طرف کلب میں بیٹھے متمول اور انٹلیکچوئل کہلانے والے لوگوں کی خوش گپیوں میں گرتی دیواریں بولتی محسوس ہوتی ہیں اور دوسری طرف ہم افریقی بیروں کو باتیں کرتے سنتے ہیں' جو کلب سے اُٹھ کر جانے والوں کے آخری پیگوں سے بچی کھچی شراب اکٹھی کر کے کاک ٹیل کا مزہ لے رہے ہیں۔ کہانی کا مرکزی خیال ریزہ گل میں دبک کر بیٹھے کیڑے کی طرح نئے دن کے لئے سورج کا انتظار کر رہا ہے۔

فیض کا ایک مصرع ہے ـــــ 'تری کج ادائی سے روٹھ کر شب انتظار چلی گئی' جوگندر پال کسی بھی کہانی کی بنیادی آواز کو روٹھ کر چلے جانے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ بڑی بات ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اردو افسانہ میں جمود آگیا ہے۔ میں جوگندر پال سے کہتا ہوں "پیارے ان لوگوں کی بات پر کان مت دھرو۔ یہ آواز ان لوگوں کی ہے جو تخلیق کے لمحوں کا ساتھ دینے سے رہ گئے ہیں۔ ابھی تو لاکھوں ان کہی باتیں ناگفتنی کے آنچل سے نکل کر گفتنی بننے کے لئے مچل رہی ہیں۔"

وہ افریقہ گڑیا آج میرے پاس ہوتی تو مجھے اس سے افریقی زبان میں

بات نہ کر سکنے کی کم مائیگی کا احساس ہوتا۔ لیکن جوگندر پال کا یہ مجموعہ دھرتی کا کال، اب میرے بک شیلف میں رہے گا جس پر وہ نیگرو لڑکی کا مجسمہ رکھا ہے۔ میں اسے بار بار پڑھوں گا۔ اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کا مشورہ دوں گا تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ اردو افسانے نے سینکڑوں میل کی دوری پر ایک پل بنا دیا ہے

جیا سبھ، جوگندر پال!

دیوندر ستیارتھی

"کلپنا"

۵ سی/۴۶ روہتک روڈ نئی دلی

۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء

افریقی الفاظ

آہُورُو	آزادی
بخشیشی	بخشش
بواتا	بالک
بُورے	ناحق
بوئی	ہاؤس بوائے
ٹوٹو	بچّہ
جامبو	سلام
جُمبا	کمرا
چکُولا	کھانا
چکونی	رسوئی
حباری	خبر
داوا	دوا
ڈُوگو	بھائی
ڈیو	ہاں

رفیقی	رفیق
سانا	بہت
سانٹے	شکریہ
سمونی	پچاس سینٹ کا سکہ
شلنگی	شلنگ
شیمبا	شیر
کارٹیسی	اخبار
کرانی	کلرک
کلمنجارو	کینیا کا ایک پہاڑ
کنگوترے	دس سینٹ کا سکہ
کوبا	بڑا
کیٹو	چیز
گو	کپڑا
ماما مضے	بڑی ماں
ماماڈوگو	چھوٹی ماں
مضے	بزرگ
مکانگا	جادو ٹونا کرنے والا
موٹو	شخص
مونگو	خدا
واٹو	آدمی

وڑُونگُو	یورپی
واڑھُواوڑھے	سب لوگ
واڑھُونیوپے	سفید آدمی
واڑھُونیوسی	کالا آدمی
واناواکھے	عورت
ویڑ آنگو	سا کٹبھو

زندگی میں کوئی قصّہ

ایک بار شروع ہو جائے تو اُسے

دُوسری بار شروع نہیں کیا جا سکتا